ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

مئی ۱۹۹۲ء

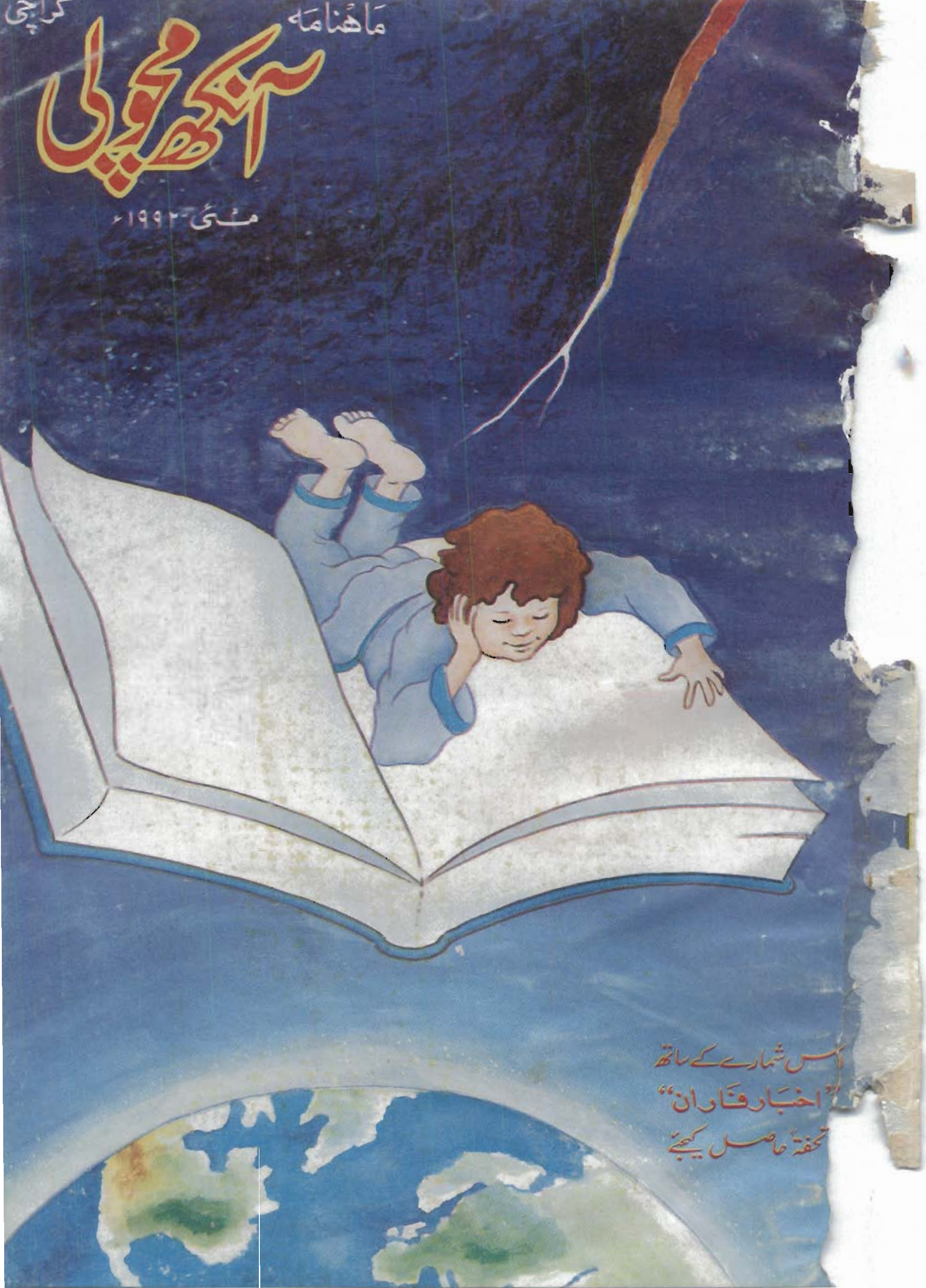

اس شمارے کے ساتھ

"اخبار فاران"

تحفۃً حاصل کیجئے

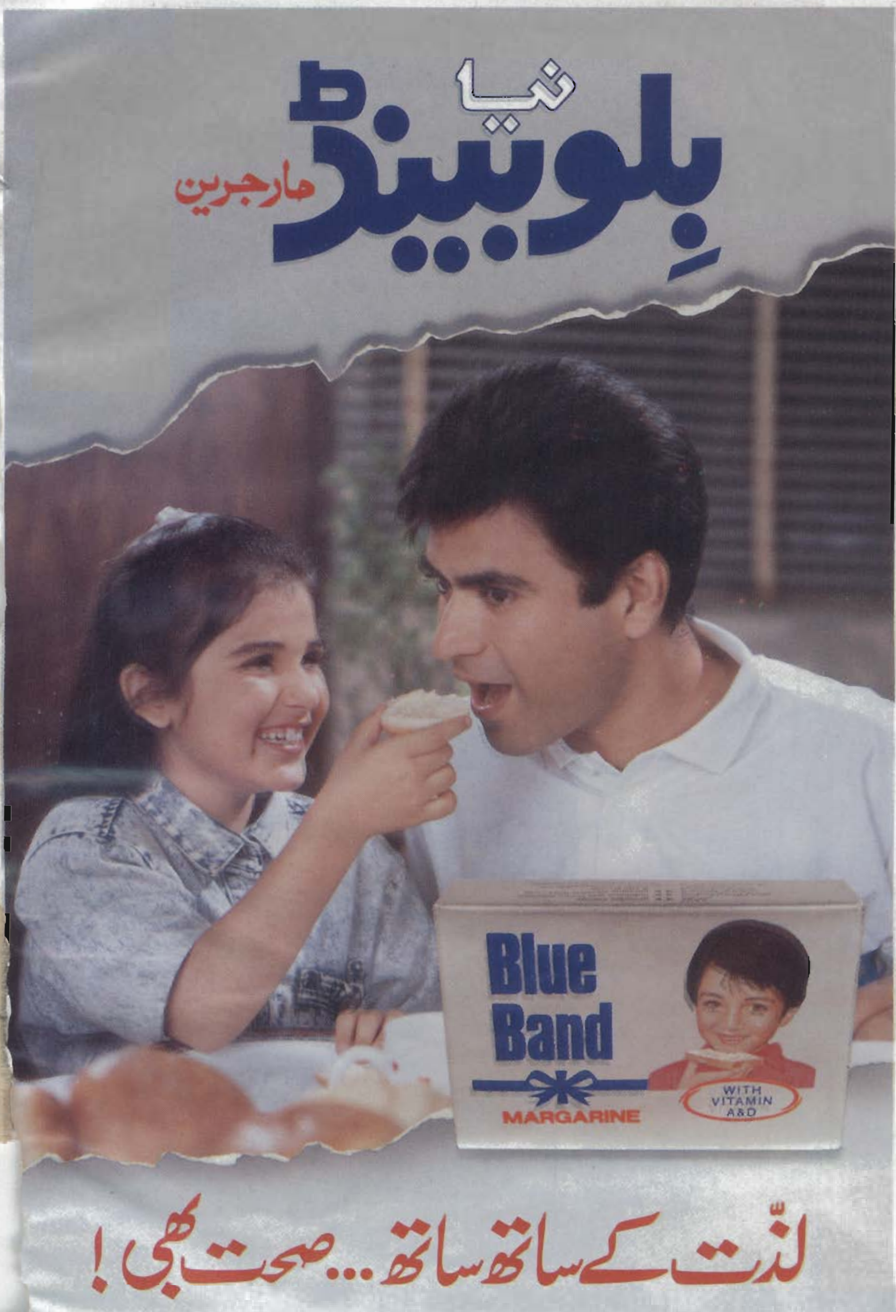
نیا
بلوبینڈ
مارجرین
Blue Band
MARGARINE
WITH VITAMIN A&D
لذّت کے ساتھ... صحت بھی!

آدابِ سفر

سفر وسیلہ ظفر ہے

اسے زحمت نہ بنائیے

سفر سے پہلے اپنے لیے سیٹ یا برتھ
ریزرو کروائیں اور اطمینان سے سفر کریں
یہ سہولت بیشتر گاڑیوں میں موجود ہے۔

براہ کرم پاکستان ریلوے سے تعاون کیجئے

محکمہ تعلقات عامہ

نسل در نسل صحت مند اور
خوش و خرّم بچے
مائیں جانتی ہیں کہ بچے اسی وقت خوش و خرم رہتے ہیں جب وہ صحت مند اور مطمئن ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ ۱۴۰ سال سے سمجھدار مائیں اپنے بچّوں کو وڈورڈ گرائپ واٹر پلا رہی ہیں۔ اس لئے ریاحی درد، ہاضمے کی خرابی یا دانت نکلتے وقت مسوڑھوں کی تکلیف میں آپ بھی اپنے بچے کو وڈورڈ گرائپ واٹر دیجیے۔ وڈورڈ گرائپ واٹر ہی بچوں کو تکلیف میں راحت پہنچاتا ہے۔
WOODWARD
بچوں کی صحت وُڈورڈ کی روایت

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

ماہنامہ آنکھ مچولی کراچی

مسلسل دوسری بار اعلیٰ معیار کا ایوارڈ حاصل کرنے والا
پاکستان کا واحد ماھنامہ

مدیرِ اعلیٰ ظفر محمود شیخ

مدیرِ مسئول ایم اے فاروقی

مشاورت مشفق خواجہ، امجد اسلام امجد

مدیرانِ اعزازی طاہر مسعود، محمد سلیم مغل

مجلس ادارت ، منیر احمد راشد

اشتہارات محمد عرفان

نمائندہ امریکہ عبدالرشید خان

رُکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رُکن پاکستان چلڈرنز میگزین سوسائٹی،
آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے
تصدیق شدہ اشاعت

- ماہ نامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی سکتی۔
- ماہ نامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن وحدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا

- ماہ نامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت وکردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا۔

جلد نمبر ۶ شمارہ نمبر ۱۱ مئی ۱۹۹۲ء شوال/ذیقعد ۱۴۱۲ھ فون ۲۹۹۱۷۸ قیمت ۱۰ روپے ۷ ریال ۷ درہم

ناشر: ظفر محمود شیخ طابع: زاہد علی مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس ایم اے جناح روڈ کراچی

خط وکتابت کا پتہ: ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی ۱۱۲ ۔ ڈی، نورس روڈ، سائٹ کراچی

حُسنِ ترتیب

تاریخ کے دریچے سے	۱۰	غلام عباس طاہر
ماہِ رواں کی پہلی بات	۱۱	ادارہ
بخدمت جناب	۱۲	خطوں کے جوابات
آخرت کیوں ضروری ہے؟	۱۶	ابنِ بلوچ
چاند اور نسیم کا پیٹر	۲۱	سیدہ نسرین اعجاز
ترانہ (نظم)	۲۸	ضیاء الحسن ضیاء
علاج	۲۹	شہاب محمود
ہمپرے کو بچا لیا گیا	۳۴	شگفتہ شمیم
شیر بنانے والے	۳۷	شان الحق حقی
رام کہانی	۴۱	سلیم مغل
ستّو میرا دوست ہے	۴۷	منیر احمد راشد
جنگل کا قانون	۵۳	عادل منہاج
آخری معرکہ	۵۹	طاہر مسعود
گاؤں کا بیلہ (نظم)	۶۵	شبیر بیگ ناز
السلام علیکم	۶۷	ڈاکٹر غلام نبی جیلانی
تیراک	۶۹	علی اکمل تصور
چیزوں کی کہانی	۷۳	آصف فرخی
کرشمہ	۷۶	اظہر نیاز
محسنِ صحافت	۸۳	علی گوہر چوہان
درِ حیرت	۸۸	ایاز محمود
سبق	۹۱	عفت گل اعزاز
مشوروں کی دکان	۹۸	نجمہ حنان
ننھی غزل (نظم)	۱۰۲	حفیظ الرحمٰن احسن
گلگلے	۱۰۳	منتخب لطائف
نئی روشنی	۱۰۷	سرمد ایوب
کوتز کہانی	۱۱۴	اسامہ بن سلیم
ہے حقیقت کچھ	۱۲۳	عقیل عباس جعفری
قلم قتلے	۱۲۷	ننھی نگارشات
ساتھی بچپن کے	۱۳۳	تعارف
امی ابو کا صفحہ	۱۳۸	ہما سلیم

آنکھ مچولی
کشمیر نمبر

کشمیر جل رہا ہے

چناروں اور مرغزاروں کے دیس میں آگ لگی ہوئی ہے — حسین سبزہ زاروں پر موت کی دہشت رقص کر رہی ہے
گیتوں کی سرزمین، آہوں اور سسکیوں کی زد میں ہے — گھر گھر صف ماتم ہے — گلی گلی آہ و فغاں ہے — گھر جل رہے ہیں
اسباب لٹ رہے ہیں — لوگ مر رہے ہیں — عصمتوں کو تار تار کیا جا رہا ہے
گلاب سنگھ کے کشمیر کو کشمیری مسلمانوں کے ظلم و بربریت کی تاریخ رقم کر دی ہے
بندوق کی نالیوں اور سنگینوں کے پہروں تلے بھی بھارت کی غلامی سے آزادی کی صدا سنائی دے رہی ہے

پورا کشمیر "پاکستان" کے نعروں سے گونج رہا ہے

آئیے! "کشمیر بنے گا پاکستان" کے نعرے کو سب کے دلوں کی دھڑکن بنا دیں

قلم اٹھائیے، ہم کشمیر کے موضوع پر آپ کی ہر تحریر کا خیر مقدم کریں گے

جولائی ۱۹۹۲ء میں آنکھ مچولی کا کشمیر نمبر شائع ہو رہا ہے

قلم کو خونِ دل میں ڈبو کر کچھ رقم کیجئے
شہیدوں، مجاہدوں اور غازیوں کا حق ادا کیجئے
ہم آپ کی نگارشات کے منتظر ہیں

(ادارہ آنکھ مچولی)

ہر قابل اشاعت تحریر کا باوقار معاوضہ

تاریخ کے دریچے سے

ہرمزان ایک مشہور ایرانی سپہ سالار تھا اور اپنی بد عہدی کے لئے مشہور تھا۔ کئی بار اس نے مسلمانوں کا مقابلہ کیا اور شکست سے دوچار ہوا۔ صلح کی، رہائی پائی اور پھر صلح نامے کی خلاف ورزی کی اور جنگ کی اور پھر شکست ہوئی۔ آخری بار جب اس نے شکست کھائی تو مسلمانوں نے اسے گرفتار کر کے حضرت عمر فاروقؓ کے پاس مدینے روانہ کر دیا۔ جب وہ حضرت عمر فاروقؓ کے سامنے پیش ہوا تو آپؓ نے اس سے فرمایا:۔

"تم نے دیکھا اللہ نے کیسے تمہاری سلطنت پارہ پارہ کر دی اور تمہیں در بدر کر دیا۔" ہرمزان حیران ہوا کہ یہ ایران کی فتح کو اپنا کارنامہ نہیں بلکہ اللہ کا عطیہ قرار دے رہے ہیں وہ بات کی تہہ تک پہنچ گیا، اس نے جواب دینے کی اجازت طلب کی، بولا:۔

"اے عمرؓ، جب تک مقابلہ ہمارا تمہارا تھا تو ہم تم پر غالب تھے۔ جب اللہ آپ کے ساتھ ہو گیا تو ہم کیسے جیت سکتے تھے۔"

غلام عباس طاہر

اداریہ

ماہِ رواں کی پہلی بات

یہ رسالہ آپ کے ہاتھوں میں اس وقت ہوگا جب آپ امتحانات کی تیاریوں میں مصروف ہوں گے۔ ایسی صورت میں یہ آپ کے لئے مناسب ہوگا کہ آپ اس شمارے کو احتیاط سے رکھ دیجئے اور اس کا مطالعہ امتحانات کے بعد کیجئے۔ اس لئے کہ آپ کی سب سے پہلی توجہ اپنی پڑھائی پر ہونی چاہئے۔ یوں بھی اچھے طلبہ امتحانات کے زمانے میں اپنے تمام مشاغل ترک کردیتے ہیں یا ان میں کمی کردیتے ہیں اور اپنے وقت کا بیشتر حصہ نصابی کتابوں کے مطالعے اور امتحانات کی تیاریوں میں لگاتے ہیں۔ آنکھ مچولی اپنے تمام ساتھیوں کو اچھے طلبہ کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہے، اس لئے کہ اچھے طالب علم ہی آگے چل کر معاشرے کے لئے مفید ثابت ہوتے ہیں۔

امتحانات کا مقصد طالب علموں کی ذہنی صلاحیتوں کو جانچنا ہوتا ہے اور یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ طالب علم نے دورانِ تعلیم کیا کچھ سیکھا؟ اور کتنا کچھ اپنے ذہن میں محفوظ کیا؟ علم وہی ہے جو حافظے میں محفوظ ہو۔ لیکن علم کو حافظے میں محفوظ رکھنے کے سلسلے میں اکثر طلبہ غلط طریقہ کار اختیار کرتے ہیں۔ وہ سارا سال تو تعلیم کی طرف سے غافل رہتے ہیں اور جب امتحانات سر پہ آجاتے ہیں تو راتیں کالی کرکے جوابات رٹتے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ امتحانی پرچے میں اگر وہ سوالات نہ آئیں جن کی تیاری کی گئی تھی تو ساری محنت پر پانی پھر جاتا ہے اور امتحان میں ناکامی کی خفت الگ اٹھانا پڑتی ہے۔ امتحانات کی تیاری کا صحیح طریقہ تو یہ ہے کہ آپ سارا سال پڑھیں، خواہ ایک گھنٹے کے لئے سہی، لیکن روزانہ مطالعے کو اپنا معمول بنالیں............ ایسی صورت میں امتحانات کے زمانے میں نہ آپ کے اعصاب پر وحشت سوار ہوگی نہ آپ کو امتحان میں ناکام ہونے کا اندیشہ ستائے گا اور نہ ہی آپ کو خواہ مخواہ اپنی راتیں سیاہ کرنی پڑیں گی۔ تعلیم ایک ڈسپلن کا تقاضا کرتی ہے۔ جو طلبہ ڈسپلن کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں، تعلیمی زندگی میں نمایاں اور ممتاز رہتے ہیں۔ ذہانت اور اچھا حافظہ بے شک خدائی عطیہ ہیں، لیکن محنت اور مسلسل کوشش سے یہ خوبیاں اپنے اندر پیدا کی جاسکتی ہیں۔ دنیا میں اکثر محنتی لوگوں نے ذہین افراد کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ لہٰذا وہ طالب علم جو وقتی طور پر کسی امتحان میں ناکام ہوگئے ہوں، انہیں ہرگز یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ وہ کندذہن ہیں۔ کندذہنی عام طور پر سستی، کام چوری اور لاپرواہی سے پیدا ہوتی ہے۔ ان بری عادتوں سے نجات حاصل کرلیجئے۔ کوئی وجہ نہیں کہ کامیابی آپ کے قدم نہ چومے۔ ہماری دعا ہے کہ ان امتحانوں میں آپ شاندار نمبروں سے کامیاب ہوں۔ ہاں لیکن یاد رہے کہ آپ کی کامیابی کے سلسلے میں ہماری دعا تبھی قبول ہوگی جب آپ حصولِ تعلیم میں سنجیدگی اور ذمہ داری کا مظاہرہ کریں گے۔

آپ کا دوست
ظفر محمود شیخ

بہ خدمت جناب

صاحب زادہ احمد منیب بگوی، سرگودھا: آپ کی کہانیوں کا معیار عام سمجھ بوجھ رکھنے والوں سے بلند ہوتا ہے لطیفے بھی چٹ پٹے نہیں ہوتے۔ تاریخ کے دریچے سے میرا پسندیدہ صفحہ ہے۔

○ ...... کہانیوں کے بلند معیار کی شکایت آپ کے علاوہ کسی نے نہیں کی۔ ویسے یہ وضاحت ضروری ہے کہ "آنکھ مچولی" کو آپ بالکل چھوٹے بچوں کا رسالہ نہ سمجھیں۔ یہ نسبتاً بڑی عمر کے بچوں کا رسالہ ہے اور اس کے لئے مضامین منتخب کرتے ہوئے ہمارے ذہن میں آٹھویں سے انٹر تک کی جماعتوں میں زیر تعلیم ساتھی ہوتے ہیں۔

محمود احمد، ڈومیلی، جہلم: میں لارنس کالج مری کا طالب علم ہوں۔ آنکھ مچولی میں کہانیاں لکھنا چاہتا ہوں۔ مگر مجھے اس کا طریقہ نہیں معلوم ہے۔ براہ کرم مجھے اس سلسلے میں معلومات فراہم کر دیں۔

○ ...... بھئی اس کا آسان سا طریقہ تو یہ ہے کہ ایک قلم اور بہت سارا کاغذ لے کے بیٹھ جائیے اور کہانی لکھ لیجئے۔ اور پھر ہمیں بھیج دیجئے۔ جہاں تک مشکل طریقے کا تعلق ہے تو پہلے خوب پڑھئے اور پھر لکھنے کی مشق کیجئے۔ جب مشق اچھی ہو جائے گی تو کہانی کا چھپنا آسان ہو جائے گا۔

محمد سلمان جھنڈیہ، ملتان: جب تک کوئی آپ کو دھمکی نہ دے، آپ خط شائع ہی نہیں کرتے لیکن میں آپ کو دھمکی نہیں دوں گا۔

○ ...... قصہ یہ ہے کہ ہم بے حد کمزور دل کے مالک ہیں۔ دھمکی سے فوراً ڈر جاتے ہیں۔ آپ نے دھمکی

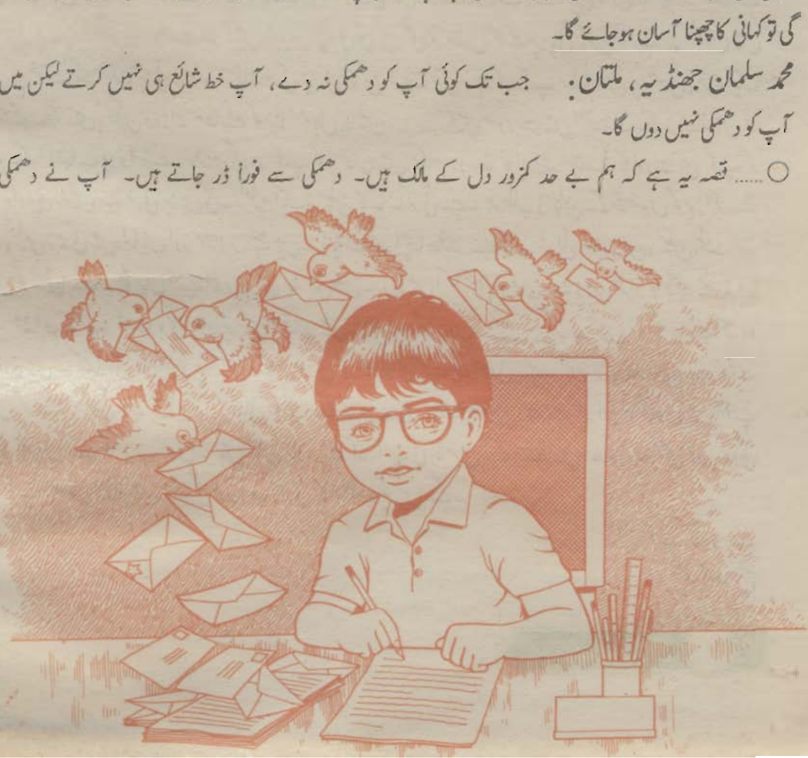

نہیں دی لیکن یہ بھی ہمیں ایک طرح کی دھمکی ہی لگی۔ اس لئے فوراً خط چھاپ رہے ہیں۔

آصف محمود، اٹک شہر۔ انکل! میری تجویز یہ ہے کہ رنگین صفحات پر عظیم پاکستانی مصور آفتاب ظفر اور پاکستان کے معروف آرٹسٹ ابوتراب مرحوم کی پینٹنگز شائع کریں۔

○ ...... ابو تراب بہت بڑے آرٹسٹ تھے، آفتاب ظفر صاحب کی تصویریں "دل دل پاکستان" میں ان کے انٹرویو کے ساتھ شائع ہو چکی ہیں۔ لیکن یہ تو بتائیے کہ کیا آنکھ مچولی کا سرورق آپ کو پسند نہیں آتا؟

جنید جاوید، کوٹلی، آزاد کشمیر: اب آپ سائنس نمبر شائع کر ہی دیجئے۔ کیونکہ یہ دور سائنس کا ہے اور ہمارا ملک سائنس میں بہت پیچھے ہے۔

○ ...... سائنس نمبر شائع کرنے کا ہمارا بھی ارادہ ہے۔ لیکن اس کے لئے بہت تیاریوں کی ضرورت ہے۔ آپ ہماری مدد کیجئے نا۔

محمد شاہد عبدالغفور، میرپور خاص: اگر میں آپ کے رسالے میں کہانی لکھوں تو آپ شائع کر دیں گے؟

○ ...... کہانی اچھی ہوگی تو کیوں نہیں۔

نور خان، نبوں: انکل! میں آنکھ مچولی کا بے حد شوقین ہوں جس مہینے یہ مجھے نہ ملے تو میرا دماغ آؤٹ آف دی کھوپڑی ہو جاتا ہے۔ میری ریڈی میڈ کھوپڑی میں ایک کہانی آئی ہے، کہئے تو لکھ کے بھجوا دوں۔

○ ...... جس محبت سے آپ نے اپنی کھوپڑی کا ذکر کیا ہے اس سے لگتا ہے کہ آپ کو اپنی کھوپڑی بہت عزیز ہے۔ اللہ اسے سلامت رکھے۔ کہانی بھیجنے کے لئے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔

کاشف طاہر، کراچی: ادھر کچھ عرصے سے کشمیر کے بارے میں آپ کے رسالے میں کچھ نہیں لکھا جا رہا ہے حالانکہ پہلے تو آپ کے ہاں نظمیں اور کہانیاں وغیرہ چھپتی رہتی تھی۔

○ ...... یہ بات نہیں ہے۔ کشمیر پر ہم ایک خصوصی شمارہ لانے کا پروگرام بنا رہے ہیں تو ایسی تمام تحریریں ہم نے اس شمارے کے لئے محفوظ کر لی ہیں۔

یفی، لاہور۔ آنکھ مچولی، ہمارا دوست بھی ہے اور ناصح بھی۔ شروع سال میں "ایئر پلانر" کا تحفہ بہترین تھا لیکن دسمبر کے خانے میں ۳ اور ۳۰ تاریخ کو منگل کے بجائے بدھ کا دن دکھایا گیا تھا۔ اس غلطی سے میرا ایک ضروری کام التوا کا شکار ہو گیا۔

○ ...... یفی صاحب! ہمیں واقعی شرمندگی ہے۔ لیکن غلطی تو انسان ہی سے ہوتی ہے نا۔

سید علی عباس، روپوالوی: آپ کے رسالے کا نومبر ۹۱ء کا شمارہ دلچسپ تھا مگر قلم قتلے کے ایک مضمون میں ایک غلطی تھی۔ مضمون میں لکھا گیا تھا کہ نپولین بونا پارٹ ۱۵ اگست ۱۹۶۹ء کو پیدا ہوئے جبکہ نپولین کی صحیح تاریخ پیدائش ۱۵ اگست

۱۹۷۹ء ہے۔ امید ہے آپ تصحیح کر دیں گے۔

○...... توجہ دلانے اور تصحیح کرنے پر ہم آپ کے ممنون ہیں۔

نوشین صدیقی، فیڈرل بی ایریا، کراچی: انکل! مجھے کہانیاں لکھنے کا بڑا شوق ہے لیکن مجھے کوئی آئیڈیا پسند نہیں آتا۔ کیا آپ مجھے کوئی آئیڈیا دینا پسند کریں گے؟

○...... کوئی آئیڈیا بھی بالکل نیا نہیں ہوتا۔ اسے لکھنے کا انداز نیا بناتا ہے۔ آپ آئیڈیا یا خیال کے پیچھے نہ بھاگیے۔ لکھنے کے انداز پر توجہ دیجئے۔

امجد حسین واہگ بلوچ، کھڈاں: کیا آپ نے بلوچستان کے بچوں کی تحریریں نہ چھاپنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو کیوں میری تحریریں ضائع ہو گئیں۔ آخر میں سگریٹ چھڑاؤ تحریک زندہ باد۔

○...... اگر آپ کی تحریر رسالے کے معیار پر پوری نہیں اتری تو یہ آپ کے سوچنے کی بات ہے اس میں صوبہ بلوچستان کا کیا قصور ہے۔ آپ اچھا لکھیں گے تو اپنا اور اپنے صوبے کا نام روشن کریں گے۔

عدیل احمد خان، کراچی: یہ آنکھ مچولی ویڈیو میگزین کا کیا سلسلہ ہے۔ آپ تو سسپنس ہی سسپنس رکھتے ہیں۔

○...... آنکھ مچولی ویڈیو میگزین کی تفصیلات آپ کو اس شمارے سے معلوم ہو جائیں گی۔

وسیم احمد، نصر پور: میں آپ سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آنکھ مچولی کی خوبصورت تصویریں کون بناتا ہے؟

○...... یہ تجارتی راز ہے آپ کو کیوں بتائیں۔ ویسے ہر تصویر کو غور سے دیکھئے اس میں کہیں نہ کہیں مصور کا نام لکھا ہوتا ہے۔

محمد قاسم گورایہ، گوجرانوالہ: کیا ہم واقعی آنکھ مچولی کو وی سی آر کے ذریعے دیکھ سکیں گے؟

○...... جی ہاں یقیناً ...... ایک پڑھنے والا رسالہ ہے دوسرا دیکھنے والا رسالہ۔

ذوالفقار احمد پرنس، لاہور کینٹ: آنکھ مچولی میں اگر آپ پاکستان کے ہر شہر کے تفصیلی تعارف کا سلسلہ شروع کر دیں تو اس سے ہماری معلومات میں اضافہ ہو گا۔

○...... تجویز اچھی ہے۔ اس موضوع پہ ہم نے مقابلہ مضمون نگاری بھی کرایا تھا۔ اب پھر غور کریں گے۔

بشیر احمد ڈبلیو ڈی بلوچ، میرواہ خیر پور: آنکھ مچولی ویڈیو میگزین کی قیمت کیا ہے؟

○...... بھئی یہ بہت قیمتی ہے۔ قیمت کے لحاظ سے نہیں معلومات کے لحاظ سے۔ قیمت اس کے اشتہار میں پڑھیے۔

کاشف عزیز، فیڈرل بی ایریا، کراچی: انکل! آنکھ مچولی کے پڑھنے والوں میں زیادہ تر غریب ہیں اور وہ آنکھ مچولی، لائبریری وغیرہ سے لے کر پڑھتے ہیں اسی لئے میری نظر میں کوپن کا سلسلہ درست نہیں ہے۔

○ ...... اگر ایسے کسی لکھنے والے کی تحریر جو قابل اشاعت ہو اور اس کا بھیجنے والا رسالہ نہ خرید سکتا ہو تو ایسی صورت میں اس کی تحریر ادارے کے لئے قابل قبول ہو گی۔

خالد عزیز نگوری، بل نگور، تربت: ہمارے گاؤں میں ڈاک کا کوئی انتظام نہیں ہے تو آپ ...... اللہ میاں سے دعا کریں کہ بل نگور میں نظام ڈاک صحیح ہو جائے۔ اس کے بعد انشاء اللہ میں اس رسالے کا خریدار بنوں گا۔

○ ...... ہماری خدا سے دعا ہے کہ وہ آپ کے گاؤں میں ڈاک، تار، بجلی پانی اور تعلیم سبھی چیزوں کا اچھا انتظام کر دے تاکہ آپ لوگ سکون سے رہ سکیں۔

جن ساتھیوں کے خطوط آئے:

(۱) عقیل احمد، لاہور (۲) محمد سلمان صدیق احمد خان سنبل، بورے والہ (۳) محمد اظہر رحمٰن رتیکا، منچن آباد (۴) راشد منہاس ثاقب، قصور (۵) افشاں غوری، حیدر آباد (۶) گلشن کمار پروانہ قلات (۷) آمنہ معین الدین حیدر آباد (۸) منیر احمد، نثار احمد سومرو ہرنائی، (۹) ممتاز حبیب صابر، مردان (۱۰) جنید عالم، لطیف آباد (۱۱) عافیہ گل، ساہرہ سحر، گوجرانوالہ (۱۲) عبدالسلام قریشی، حیدر آباد (۱۳) اطہر رضا اجنبی، پرانا لالوکھیت، کراچی (۱۴) لیاقت علی، لاہور (۱۵) نیک محمد نونا، کراچی (۱۶) ن، م ترخیوال، سوات (۱۷) سلطان آصف، جہلم (۱۸) اشفاق ناز، کراچی (۱۹) نوید ڈار، کوئٹہ (۲۰) محمد اللہ ہمدرد عقیل درگئی (۲۱) صائم رشید انصاری گجرات (۲۲) بشیر احمد مغل، گجرات (۲۳) محمد ساسکلین شاہ کھوکھرائی، حیدر آباد (۲۴) اے منان خرم بٹ، لاہور (۲۵) علی اصغر سیال، ساہیوال (۲۶) محمد مفلحین، پرانا سکھر (۲۷) محمد نواز اعوان فیصل آباد (۲۸) یونس صدیق لالپوریا، فیڈرل بی ایریا، کراچی (۲۹) محمد اعجاز عابد، ضلع خوشاب (۳۰) عبدالحفیظ شاہد، مخدوم پور پہوڑاں (۳۱) سعید سفیان کاکاخیل نافعی، اسلام آباد (۳۲) یاسمین ناز، کراچی (۳۳) ندیم شاہد، خانیوال (۳۴) سید حسین نصر، روپوال (۳۵) ذوالفقار احمد، گجرات (۳۶) شاہ نواز گل، مردان (۳۷) عدیلہ اسلم گوجرنوالہ (۳۸) مجاہد حسین باسط، اوکاڑہ (۳۹) عرفان، کوٹری (۴۰) ارم منظور، راولپنڈی (۴۱) محمد زمان، بارکھان (۴۲) انیلہ جبین، گوجرانوالہ (۴۳) رضوانہ شاہ، میانوالی (۴۴) علی احمر قریشی، جہلم (۴۵) خالد بخاری، گھوٹکی (۴۶) قیصر محمود قیاسی، مانسہرہ (۴۷) ظہور احمد سواتی، کراچی (۴۸) سید محمد احمر، سکھر (۴۹) شہلا یاسمین، واہ کینٹ (۵۰) حاجی محمد اسماعیل، ملتان (۵۱) شہزاد خلیل، ملتان (۵۲) سید محبوب شاہ، واربرٹن (۵۶) گلزار احمد تبسم، گول پور (۵۷) عبدالرحیم، لسبیلہ (۵۸) آغا فاروق احمد، کندکوٹ، جیکب آباد (۵۹) رضی خاں، رحیم یار خاں (۶۰) فوزیہ عباس، نصیر آباد، کراچی (۶۱) تنویر شہزاد، بھاولپور (۶۲) واصف طاہر (؟) (۶۳) اظہر عباس، شور کوٹ (۶۴) لطیف، فیصل آباد (۶۵) اعجاز بلوچ حیدر آباد (۶۶) طیبہ نثار چیمہ، گجرات (۶۷) عاطف بن عبدالرحمٰن، دوحہ (۶۸) منصور احمد خان، دریا خان (۶۹) عرفان حیدر، صادق آباد (۷۰) طاہر محمود خان، چارسدہ۔

آخرت کیوں ضروری ہے؟

ابنِ بلوچ

قرآن دنیا کی واحد الہامی کتاب ہے جو اپنی اصل حالت میں موجود ہے۔ ایسا اس لئے ممکن ہوا کہ قرآن کو نازل فرمانے والا اللہ تعالیٰ ہے اور اس نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ قرآن کا مخاطب انسان ہے۔ ہر دور کا انسان ...... ہر علاقے کا انسان ...... وہ انہیں تین بنیادی حقیقتوں سے واقف کرانا چاہتا ہے۔ یہ تین بنیادی حقائق اسلام کے بنیادی عقیدے ہیں۔ اسلام کے سارے احکام انہی عقائد کو ماننے سے وجود میں آتے ہیں۔ یہ عقائد توحید، رسالت اور آخرت ہیں۔ سب سے پہلے ہم آپ کو آخرت کے بارے میں بتائیں گے۔ آخرت کے عقیدے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں

یہ زندگی آزمائش کے طور پر دی ہے۔ زندگی کی تمام نعمتیں، جو ہمیں حاصل ہیں، عارضی طور پر ہمیں دی گئی ہیں۔ یہ سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، سمندر، دریا، درخت، میدان، باغ، کھیت اور خود ہماری زندگی، سب کچھ عارضی ہے۔ ان سب کو ایک دن تباہ ہو جانا ہے۔ اس دن کو قیامت کہتے ہیں۔ جب یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا تو اللہ تعالیٰ ہمیں دوبارہ زندہ کرے گا۔ حضرت آدم علیہ اسلام سے لے کر قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں کو۔ دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا کر دے گا۔ پھر ان سب سے پوچھے گا کہ انہوں نے زندگی کیسے گزاری۔ نیک بن کر یا بد بن کر۔ شکر گزار بن کر یا ناشکرے بن کر۔ جو لوگ زندگی میں زیادہ تر نیک رہے ہوں گے ان لوگوں کو جنت میں بھیج دیا جائے گا۔ وہاں پر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی پسند اور خوشی کی زندگی بسر کریں گے۔ جو لوگ جانتے بوجھتے ہوئے گناہ اور ظلم کی حالت میں زندگی گزار کر آئے ہوں گے۔ ان کو جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ اس کا عذاب وہ ہمیشہ کے لئے سہتے رہیں گے۔

ظاہر ہے یہ بات بہت بڑی بات ہے۔ اسے بغیر کسی دلیل اور ثبوت کے رد نہیں کیا جا سکتا۔ جب کہ اس عقیدے کے حقیقت ہونے کا یہ عالم ہے کہ انسان کے شب و روز اس کی گواہی دے رہے ہیں۔ مثلاً دیکھئے کہ انسان ملک بنا کر ایک قانون اور حکومت کے تحت کیوں رہتا ہے؟ صاف ظاہر ہے کہ انصاف حاصل کرنے کے لئے قبیلوں سے لے کر منظم حکومتوں تک اور سرداری اور بادشاہت سے لے کر جمہوریت تک کا سارا سفر، انسان نے صرف اس لئے کیا ہے وہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے قانون کو ظلم سمجھتا ہے۔ ہر انسان چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ انصاف ہو، کوئی اس کے ساتھ زیادتی نہ کرے، وہ کسی کے دھوکے میں نہ آئے، کسی جھوٹ کے فریب کا شکار نہ ہو۔ اسی لئے اس نے ظالموں اور مجرموں کو پکڑنے کے لئے پولیس قائم کی۔ ان کو سزا دینے کے لئے جیلیں اور پھانسی کی کوٹھڑیاں بنائیں۔ قصور وار اور بے قصور میں فرق کرنے کے لئے عدالتیں قائم کیں۔ برے لوگوں کو حکومت سے دور رکھنے کے لئے جمہوریت کا سہارا لیا۔ بیرونی دشمنوں کے ظلم سے بچنے کے لئے بڑی بڑی فوجیں بنائیں۔ بے پناہ اسلحہ تیار کیا۔ یہ سب کچھ انسان نے صرف اور صرف انصاف حاصل کرنے کے لئے کیا۔ غرض اس انصاف اور عدل کے لئے انسان نے کیا کچھ نہیں کیا۔ صاف نظر آتا ہے کہ انصاف اس کی زندگی کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ اسے یقین ہے کہ اس کے بغیر وہ اپنی پیاری زندگی کا ایک دن بھی خیر و عافیت سے نہیں گزار سکتا۔

آیئے اب دیکھیں کہ وہ زندگی کی اس اہم ترین ضرورت کو حاصل کرنے میں کتنا کامیاب ہوا ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ انسان کو سب سے زیادہ ناکامی انصاف حاصل کرنے میں ہی ہوتی ہے۔ دنیا

میں ہر روز معلوم نہیں کتنے بے قصوروں پر ظلم ہوتا ہے، کتنے گھروں پر ڈاکا ڈالا جاتا ہے، بے شمار لوگوں کے حقوق مار لئے جاتے ہیں۔ غرض ظلم اور زیادتی کی وہ کون سی قسم ہے جو نہیں کھائی جاتی۔ لیکن انسان کی ساری عدالتیں، اس کی ساری پولیس، انصاف کے یہ سارے محافظ ان تمام ظالموں میں سے چند ایک کو پکڑتے ہیں۔ ان گنت ظالم، غنڈے اور بد معاش صاف بچ جاتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے پولیس کسی قاتل یا ڈاکو کو گرفتار کر لیتی ہے، لیکن عدالت ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے اسے چھوڑنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ یہ بات بھی سب کو معلوم ہے کہ بعض اوقات پولیس اور عدالت خود مجرم کی حمایت کر دیتی ہے اور مظلوم سوائے آہیں بھرنے اور بد دعائیں دینے کے اور کچھ نہیں کر پاتا۔ یہ واقعہ بھی انسان نے بار بار ہوتے دیکھا ہے کہ کوئی انتہائی بد معاش اور قاتل گرفتار ہوتا ہے۔ درجنوں انسانوں کا قاتل ہوتا ہے، بہت سے بے گناہ اس کی زیادتیوں کا شکار ہو چکے ہوتے ہیں، قانون اسے موت کی سزا دیتا ہے۔ اسے پھانسی دے دی جاتی ہے۔ لیکن کیا اس سے انصاف ہو گیا؟ اس نے تو کئی انسانوں کو مارا تھا۔ انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ اسے ہر جان کے بدلے میں مارا جاتا۔ اسے بار بار زندہ کیا جاتا اور بار بار مارا جاتا لیکن یہ انسان کے بس میں نہیں ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ اب مجرم قانون کے ہاتھ لگنے سے پہلے خود کشی کر لیتا ہے یا وہ مر جاتا ہے، اور انصاف حاصل کرنے والے ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال جنگ عظیم اول اور دوم ہے۔ ہٹلر کی ضد اور غرور نے جب ساری دنیا کے لئے امن کا خطرہ پیدا کر دیا تو پوری دنیا اس کے خلاف متحد ہو گئی۔ لیکن جب جنگ عظیم دوم کے موقع پر اتحادی فوجیں اس کے گھر تک جا پہنچیں تو معلوم نہیں وہ کہاں غائب ہو گیا۔ ساری دنیا نے اسے سزا دینے کے لئے بے شمار انسانوں کو قربان کیا لیکن وہ بڑے مجرم کو سزا دینا تو ایک طرف اسے عدالت میں لانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ انسان کی بے بسی کا یہ عالم بہت عبرت ناک ہے۔

اس دنیا پر بڑے بڑے انصاف پسند حکمران بھی گزرے ہیں نبیوں، اور رسولوں نے بھی حکومت کی ہے، حضرت عمر فاروقؓ اور نوشیرواں عادل کا دور بھی گزرا ہے۔ انہوں نے پھر اس شخص سے انصاف کیا، جو ان کی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکے، لیکن معلوم نہیں کتنے مظلوم ایسے بھی ہوں گے جو ان تک نہ پہنچ سکیں ہوں گے، جن تک یہ نیک اور عادل حکمران نہ پہنچ سکے ہوں گے۔

اس طرح کئی نیک لوگ ایسے بھی ہوں گے، جنہوں نے احسان اور ایثار کی خاطر دوسروں سے نیکی کی ہو گی۔ ایسے بھی ہوں گے جنہوں نے دوسروں کی خاطر اپنی زندگی قربان کر دی ہو گی۔ ایسے بھی ہوں گے جن کی ساری مسکراہٹیں بیماری نے چھین لی ہوں گی۔ اور بے آسرا ہیں ہوتے بھی جو ساری زندگی محبت اور ہمدردی کی آس میں گزار دیتے ہیں۔ ان معصوم بچوں کا بھی تصور کیجئے جو ان کھلے پھول ہونے

کے باوجود قسمت کی خزاں کا شکار ہو کر مرجھا جاتے ہیں غرض اس دنیا میں بلاشبہ انصاف بھی ہے لیکن ناانصافی اور محرومی کی بھی کوئی حد نہیں۔

یہ ہماری دنیا میں ہونے والے انصاف کی ایک جھلک ہے۔ اس کی تفصیل بہت طویل ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے وہ کون سا انسان ہے جس کے دل میں یہ خواہش نہیں ہوگی کہ ایک عدالت ایسی بھی لگنی چاہئے جہاں ہر شخص کو پورا پورا انصاف ملے۔ جہاں پر نیکی چاہے ذرہ برابر بھی کیوں نہ ہو، اس کا صلہ ملے اور بدی اگرچہ معمولی سی ہی ہو، اسے کرنے والے کو اس کا احساس دلایا جاسکے۔ لاتعداد انسانوں پر ظلم کا سبب بننے والوں کو بار بار زندہ کیا جائے اور بار بار موت سے دوچار کیا جائے۔ بددیانتی اور ناانصافی کی طاقت رکھتے ہوئے ایمانداری اور انصاف کرنے والوں کو ان کی توقع سے بھی زیادہ اجر دیا جائے۔ غرض ہر انسان کو وہ انصاف میسر ہو کہ جس کے بعد مزید کسی انصاف کی ضرورت نہ رہے۔ ہر انسان کی اسی ضرورت کا نام آخرت کا عقیدہ ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ آخرت اس دنیا کا تقاضا اور انسان کی سب سے بڑی خواہش ہے۔ اس کے بغیر ہر مظلوم کو خودکشی کر لینی چاہئے اور ہر بے سہارا کو مایوس ہو جانا چاہئے۔

آخرت کی دوسری بڑی دلیل یہ ہے کہ اگر ہم مانتے ہیں اس دنیا کو بنانے والا وہ اللہ تعالیٰ ہے جس نے سورج اور زمین میں اتنا فاصلہ رکھا کہ زمین پر زندگی ممکن ہو سکے۔ جو پتھر میں رینگنے والے کیڑے کو بھی رزق دیتا ہے، جو اندھیری رات میں درخت سے گرنے والے پتے کی بھی خبر رکھتا ہے جو زندگی اور موت پر قادر ہے، جو کسی پر بھی ذرہ بھر ظلم نہیں کرتا۔ تو کیا ایسا پروردگار اس دنیا میں ہونے والے اس ظلم اور اس محرومی کو برداشت کرے گا، جس کی ایک جھلک ہم نے اوپر پیش کی ہے؟ کیا اس کا عدل اس بات کا تقاضا نہیں کرتا کہ کوئی مجرم سزا کے بغیر نہ رہ سکے؟ کیا اس کی رحمت یہ گوارا کر سکے گی کہ دوسروں کی خاطر مرنے والے اور زندگی کی رنگینیوں سے محروم لوگ مر کر مٹی ہو جائیں اور ان کی نیکیوں اور محرومیوں کا کوئی صلہ نہ دیا جائے...... ؟ کیا اس نے اتنے بڑے نظام کو بغیر کسی مقصد کے محض کھیل تماشہ کے لئے بنایا ہے؟ کیا اس کی قدرت کی طاقت صرف اتنی ہے کہ وہ اس دنیا میں زندگی پیدا کر کے بیٹھ جائے اور پھر اپنی بنائی ہوئی دنیا میں ہمیشہ ظلم اور کبھی کبھی انصاف ہوتا دیکھتا رہے اور انصاف کے تقاضے کے باوجود سب کو یونہی مر کر مٹی میں مل جانے کی اجازت دے دے؟ اگر وہ قادر ہے، رحیم ہے، عادل ہے اور پروردگار ہے تو پھر وہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے والا دن ضرور لائے گا اور نیکوں کے لئے جنت اور بروں کے لئے جہنم، ضرور بنائے گا!!

(باقی آئندہ)

سائنس پوائنٹ

وڈیو فون

وڈیو فون سائنس کی ایک حیرت انگیز ایجاد ہے، جس میں آپ بات کرنے کے ساتھ ساتھ بات کرنے والے کی تصویر بھی دیکھ سکتے ہیں۔
یہ وڈیو فون کچھ عرصہ پہلے تک انتہائی مہنگا تھا جو کہ ہر ایک کے استعمال میں نہیں آ سکتا تھا۔ لیکن اب متسوبشی کمپنی جاپان نے سستے وڈیو فون تیار کرنے شروع کر دیئے ہیں۔ تصویر میں نظر آنے والے وڈیو فون کی قیمت ۵۰۰ ڈالر ہے۔

جدید دور کی جدید کار

تصویر میں نظر آنے والی کار موجودہ دور کی ایک جدید کار ہے جو کئی جدید سائنسی سہولیات سے آراستہ ہے۔ اس کار میں ٹی وی، ریڈیو، اور پرسنل کمپیوٹر کے علاوہ ایک جدید آلہ جو کہ لیزر اور الٹرا سونک کی مدد سے کام کرتا ہے موجود ہے۔ یہ آلہ ڈرائیور کو ایک چھوٹی سی اسکرین پر یہ بتاتا ہے کہ اس گاڑی کے آس پاس اور کونسی گاڑیاں ہیں اور کار پارکنگ میں کونسی جگہ خالی ہے۔ اس گاڑی میں اور بہت سی خصوصیات ہیں جو کہ ایک عام گاڑی میں نہیں ہوتیں۔

انسانی طاقت کی مدد سے پرواز

یہ جہاز جو آپ دیکھ رہے ہیں، یہ جدید انجینئرنگ کا شاہکار ہے۔ اس جہاز کا وزن ۷۲ پونڈ ہے اور یہ ۱۸۶۵ کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑ سکتا ہے۔ لیکن اس کو اڑانے کے لئے کسی تیل وغیرہ کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ یہ انسانی طاقت کی مدد سے اڑتا ہے۔ اس جہاز میں ایک پیڈل لگا ہوا ہے جس کو چلانے سے جہاز پرواز کرتا ہے۔ اس جہاز پر ممتاز سائیکلسٹ (Kanellos Kannellopulo-slos) نے مسلسل چار گھنٹے پرواز کر کے ۷۲ کلو میٹر کا فاصلہ طے کیا جو کہ ایک ریکارڈ ہے۔

شمسی توانائی سے چلنے والی ریسنگ کار

تصویر میں نظر آنے والی عجیب و غریب کار شمسی توانائی یعنی سورج کی روشنی سے چلتی ہے۔ اس کار میں دوسری کاروں کے بر خلاف تین پہیئے (دو آگے ایک پیچھے) نصب ہیں۔ اس کار کو ہنڈا کمپنی کی ایک ٹیم نے کار ریس کے مقابلوں کے لئے تیار کیا ہے۔ اس کار کی زیادہ سے زیادہ اسپیڈ ۷۵ کلو میٹر فی گھنٹہ ہے۔ اس کار نے ۱۹۹۰ء میں آسٹریلیا میں ہونے والی "ورلڈ سولر چیلنج" میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔

دنیائے ایجادات

تلخیص و ترجمہ
ش م خالد

جدید دَور کی حسین کار

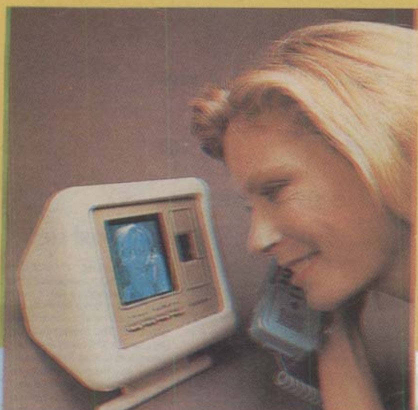

آج کی ایجاد/مستقبل کا وڈیو فون

شمسی توانائی سے چلنے والی کار

باسی عید کی کہانی

چاند اور نیم کا پیڑ

سیدہ نسرین اعجاز

نیم کا درخت، چاند اور خاندان بھر کے بچے، عید کی ساری رونقیں ان تینوں کے دم سے تھیں۔ بچوں کے لئے زندگی کی سب سے بڑی خوشی عید کی خوشی تھی اور جس دن بھی عید کے چاند کو اپنی جھلک دکھانی ہوتی اس دن سارے بچے حتیٰ کہ بڑے بوڑھے بھی نیم کے درخت کے اوپر آسمان کو دیکھنے لگتے، کیونکہ چاند ٹھیک وہیں پہ چھپا ہوتا تھا۔ سب کو بس ایک ہی فکر کھائے جاتی تھی کہ کوئی اس سے پہلے نہ چاند دیکھ لے اور گھر بھر میں شور مچا کر اس بات پر فخر کرے کہ سب سے پہلے چاند اس نے دیکھا ہے اور جب سب اس سے پوچھیں کہ کہاں ہے چاند، ہمیں بھی دکھاؤ، اس وقت تمام بچے اسے رشک سے دیکھتے رہ جائیں۔ طارق کو اس نیم کے درخت سے پیار تھا۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اگر یہ نیم کا درخت نہ ہوتا تو چاند بھی

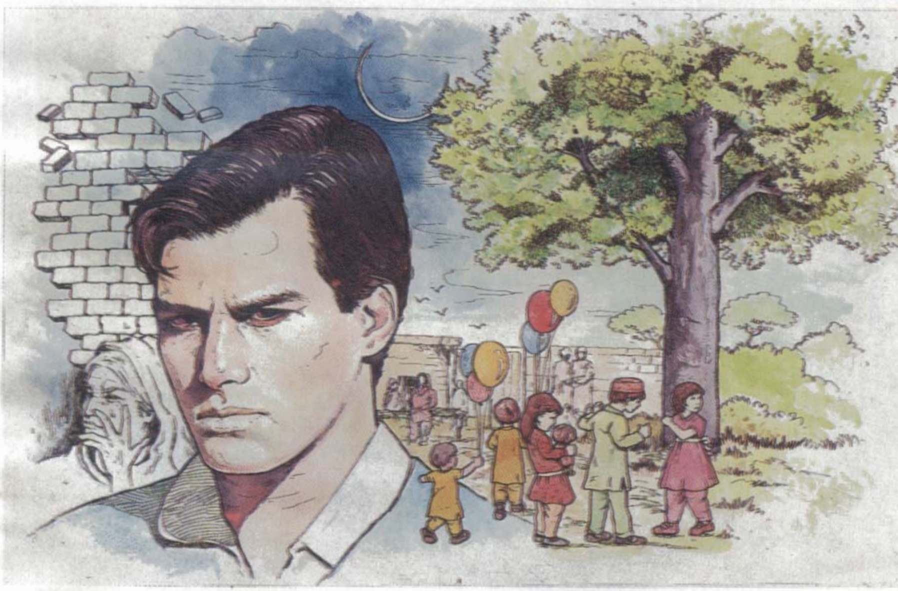

نظر نہ آتا۔ اس کی اس، معصومانہ بات پر سب ہی ہنستے تھے۔ ہر عید پر چاند رات کی تمام رونقیں اس بڑے سے صحن پر پھیلے ہوئے نیم کے درخت کے نیچے سمٹ آتی تھیں۔ بڑی تائی نیم تلے بچھے تخت کے ایک کونے پر عید کی صبح کے لئے شیر خورمہ کے لئے باریک باریک بادام اور پستے کی ہوائیاں کاٹنے بیٹھ جاتی تھیں اور ساتھ ہی خاندان بھر کی لڑکیوں کو بُرا بھلا بھی کہتی جاتی تھیں کہ وہ ہر کام چاند رات کے لئے کیوں اٹھا رکھتی ہیں۔ ایک کونے میں چھوٹی پھپھو حنا کے دوپٹے میں گوٹا کناری لگانے کے ساتھ ساتھ بڑی باجی اور اپیا کو چادر اور پردے بدلنے کے لئے ہدایات دینا شروع کر دیتی تھیں۔ ایک طرف ماں جی خاندان بھر کی لڑکیوں کا اپنے آگے جھمگھٹا لگائے باریک تنکے کی مدد سے مہندی سے بیل بوٹے بنایا کرتی تھیں۔ لڑکیوں کے مہندی لگتے دیکھ کر تمام لڑکے بھی ضد کرواکر اپنی ہتھیلیوں پہ ماں جی سے چاند تارا بنواتے تھے۔ باورچی خانے سے مسلسل رحیمن بی بی کے کھٹر پٹر کی آوازیں آنے لگتی تھیں۔ کام سے فارغ ہو کر تمام لڑکیاں بالیاں چوڑی پہننے بیٹھ جاتی تھیں۔ لڑکوں کو اور کوئی کام نہ ملتا تو وہ لڑکیوں کے سر پر سوار ہو کر ان کی چوڑیوں کی پسند میں مین میخ نکالنے لگتے تھے جس کے نتیجے میں کبھی کبھار لڑکیوں کے منہ پھلانے اور لڑکوں کا بڑی تائی کے ہاتھوں پٹنے کا واقعہ بھی رونما ہو جاتا تھا۔ تمام بچے جو عام دنوں میں کسی طور صبح سویرے اٹھنے پر تیار نہ ہوتے عید کے دن اپنی ماؤں کے کہنے سے پیشتر صبح نور تڑکے اٹھ کر بیٹھ جاتے تھے۔ وہ خوشی جو عید کے کپڑے پہن کر نصیب ہوتی تھی وہ عام دنوں میں کہاں۔ نماز پڑھ کر آتے ہی بڑوں پر نظر رکھنا کہ کہیں کوئی عیدی دینے سے بچ نہ جائے۔ عید کے دن جو بات طارق کو کھٹکتی تھی وہ بڑی تائی کا رونا تھا۔ تمام لوگ ایک دم اداس ہو جاتے۔ چپ چاپ خاموشی سے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کا بہانہ کرتے۔ ماں جی کہا کرتی تھیں کہ بڑی تائی کو وہ لوگ یاد آتے ہیں جو بچھڑ گئے۔ جب بہت زیادہ خوشی کا موقع ہو تو بچھڑنے والے یاد آہی جاتے ہیں۔ نہ جانے کیوں طارق کو یہ بات عجیب سی لگتی شاید اس کی اصل وجہ اس کی عمر تھی جو کہ ان باتوں کو سمجھنے کے لئے ناکافی تھی۔

کئی عید کے چاند اس صحن میں کھڑے نیم کے درخت کے پیچھے سے طلوع ہو گئے۔ جو باتیں طارق کو اس وقت سمجھ نہ آتی تھیں اب ذہن انہیں سمجھنے لگا تھا کیونکہ وہ خاندان کے اور دوسرے بچوں کی طرح اب بڑے شہر میں پڑھتا تھا، ہر سال عید میں ضرور خاندان بھر کے لوگ یہاں جمع ہو جاتے اور عید ویسے ہی رنگ ڈھنگ سے اس گھر میں اتر آتی۔ طارق کو اب خوشی کے موقع پر بڑی تائی کا رونا اور اداس ہونا بھی عجیب نہیں لگتا کیونکہ اب وہ بھی رشتوں سے جذباتی لگاؤ کو سمجھنے لگا تھا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود، شعور کی اس منزل پر پہنچنے کے باوجود اس کی نظر میں وہ نیم کا درخت اب بھی ویسا ہی تھا۔ عید کے چاند کی باریک لکیر کے لئے نیم کا درخت اب بھی ویسا ہی ضروری تھا۔

اس سال جب عید آئی تو طارق پورے دو سال بعد گھر لوٹ رہا تھا۔ پچھلے سال امتحانات کی وجہ سے وہ عید پر گھر نہ آسکا تھا۔ خاندان اور گھر والوں سے دور تنہائی میں عید گزارنے کا بہت تلخ تجربہ رہا تھا۔ لہٰذا اس دفعہ عید میں گھر جاتے ہوئے وہ بہت پر جوش تھا۔ گھر پہنچنے کے بعد بہت ساری خبریں اس کی منتظر تھیں۔ بڑی تائی اب دنیا میں نہیں رہی تھیں۔ تخت کا وہ مخصوص کونا اداس اور خالی تھا۔ اس حصے کی طرف دیکھتے ہوئے طارق کی آنکھیں بھر آئیں۔ اسے ایسا لگا کہ ابھی بڑی تائی کہیں سے چلتی ہوئی وہاں آکر بیٹھ جائیں گی اور اپنے خاص انداز میں بچوں کو ڈانٹتے ہوئے خاموشی سے بیٹھنے کو کہیں گی اور ذرا بھی خاموش ہونے پر فوراً بلاتے ہوئے کہیں گی "اے اتنی بھی کیا خاموشی میرا تو دل ہی دہلا جا رہا ہے۔" چاند رات کو بچے ان ہی سے قابو میں رہتے تھے۔ وہ نہ رہیں تو طارق کو لگا جیسے عید ادھوری ہو گئی ہو۔

دوسری خبر چھوٹی چچی کا اپنے بال بچوں سمیت اپنے علیحدہ گھر میں چلے جانا تھا۔ کیونکہ اب یہ گھر ان کی ضروریات کے لئے پورا نہیں پڑتا تھا۔ ان کے چلے جانے سے اس گھر کا ایک اور کونا اداس ہو گیا تھا۔ طارق کو لگ رہا تھا کہ ہر آنے والا نیا سال اپنے ساتھ بے شمار تبدیلیاں بھی لے آتا ہے۔ بھرپور خوشیوں کے دن گویا بچپن کے ہی ہوتے ہیں جن میں دکھ تو شاید ہوتے ہوں مگر ان کو محسوس کرنے کی عمر نہیں ہوتی۔ تیسری خبر طارق کو کسی نے دی نہیں بلکہ گھر میں داخل ہوتے ہی اسے اس تبدیلی کا احساس ہو گیا۔ دبی مٹی کا کچا صحن جس میں نیم کا درخت پوری شان سے کھڑا ہوتا تھا اب پختہ سیمنٹ کے فرش میں تبدیل ہو گیا تھا۔ صرف اتنا ہی حصہ کچا تھا جتنے حصے میں نیم کا درخت کھڑا تھا۔ یہ کچھ دیکھ کر طارق کو اور بھی عجیب سا لگا جیسے کہ نیم کے درخت میں وہ شان وہ آب و تاب نہ رہی ہو، جیسے کہ اس کی زمین اس سے چھین لی گئی ہو۔ عجیب سی بے چارگی اس درخت کے چاروں طرف طارق کو منڈلاتی ہوئی محسوس ہوئی۔

اس دفعہ آنے والی عید طارق کے لئے اس لئے بھی اہم تھی کہ یہ عید عمر کے اس حصے میں آرہی تھی جبکہ اس کا شمار بچوں میں نہیں ہوتا تھا۔ خاندان بھر کے وہ بچے جو اس کے عہد میں تھے اب ان سب کا شمار بڑوں میں ہوتا تھا۔ ان کی جگہ اب نئے بچوں نے لے لی تھی۔ ماں جی ہر آئے گئے کو فخر سے بتاتیں کہ ان کا بیٹا پوری دس جماعتیں پاس کر آیا ہے۔ بڑے بوڑھے اب اس کی رائے کا احترام کرتے۔ کچھ باتوں پر اس سے صلاح و مشورہ بھی لیا جاتا۔ اس کی باتوں کو اب ہنسی میں اڑانے کے بجائے سنجیدگی سے سنا جاتا۔ عمر کا یہ حصہ طارق کو بچپن سے زیادہ تو پسند نہیں آیا لیکن بہر حال اس نے اسے قبول کیا۔ دھیرے دھیرے بڑھتی ہوئی سنجیدگی اور آہستہ آہستہ وارد ہوتی ہوئی شعور کی اس منزل پر اس نے بھی اپنا پڑاؤ ڈال دیا۔ عمر کے اس حصے میں آنے والی عید میں تیزی یا تندی کے بجائے

ایک دھیماپن تھا۔ چاند کو دیکھنے کی جستجو میں وہ کم اور چھوٹے بچے زیادہ شامل تھے، گزرے ہوئے وقت کی طرح۔ چاند نظر آجانے پر بھی شور مچا اور سب بوکھلا بوکھلا کر اپنے ادھورے کام سمیٹنے کی فکر میں لگ گئے۔

اور پھر دھیرے دھیرے رات سرکتے ہوئے صبح کی گود میں جا سوئی۔ صبح پھر ایک ہنگاما اٹھا جو کہ مردوں کے عید گاہ جانے پر ختم ہوا۔ عید گاہ سے واپسی پر طارق نے بڑی تائی کی جگہ ماں جی کو دیکھا، ویسے ہی چپکے چپکے آنسو بہاتے ہوئے۔ شاید بڑی تائی اپنی اور ذمہ داریاں ماں جی کے کندھوں پر ڈالنے کے علاوہ یہ ذمہ داری بھی انہیں سونپ گئیں تھیں یا پھر غیر محسوس طریقے سے ماں جی نے ان کی جگہ لے لی تھی۔

اس دفعہ طارق کو عیدی دینے والوں کی تعداد کم ہو گئی تھی کیونکہ اب طارق کی باری تھی ان چھوٹے چھوٹے بچوں کو عیدی دینے کی۔ عید کے دن جھولے میں بیٹھنے کی عمر بھی اب طارق کی نہیں بلکہ آنے والی نسل کی تھی۔ دلچسپیوں کا محور اب بدل گیا تھا، اسے یہ ساری چیزیں یاد تو آتی تھیں مگر ان کو اختیار کرنے کا خیال کافی مضحکہ خیز لگتا تھا۔ اب دوستوں اور رشتے کے بھائیوں سے گپ شپ اور ہنسی مذاق کے دن تھے۔

عید کے کچھ دنوں بعد وہ واپس شہر آگیا، اپنی تعلیم مکمل کرنے۔ ہر عید کے گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ تعلیم کے میدان میں ترقی کی منزلیں طے کرتا گیا۔ اب جو عید طارق کی زندگی میں آئی تھی وہ بہت ساری ذمہ داریاں بھی اس کے کندھوں پر دھر گئی تھی۔ وہ اب ایک تعلیم یافتہ، باشعور اور ذمہ دار شخص تھا جس کے کاندھوں پر اب اس کے گھر والوں کی بھی ذمہ داری تھی۔ جس کو احسن طریقے سے پورا کرنے کی فکر نے اس میں بردباری پیدا کر دی تھی۔ لہٰذا اس دفعہ گھر جاتے ہوئے کئی پریشانیاں اس کا احاطہ کئے ہوئے تھیں۔ بہن بھائیوں کی عید کی ضروریات، گھر کی فکر، ماں جی کا خیال، اس کے ذہن کو الجھاتے رہے۔ گھر کے نزدیک آتے ہی وہ ٹھٹھک کر رک گیا، کیا یہ اسی کا گھر ہے!! سادہ سی ستونوں والی عمارت کی جگہ اب ایک خوبصورت جدید عمارت اپنے سر کو اٹھائے کھڑی تھی۔ اندر داخل ہو کر وہ مزید حیران ہوا، گویا ان چند سالوں میں ہر چیز ہی بدل گئی۔ نہ صرف وہ گھر بلکہ اس گھر میں رہنے والوں کے انداز زندگی بھی بدل گئے تھے۔ وہ سادہ زندگی اب مفقود تھی۔ نئی نسل کی نئی ضروریات اور نئی دلچسپی اس کے لئے کوئی عجیب بات نہیں تھی مگر اپنے گھر کو ویسے ہی دیکھنے کی خواہش جیسی کہ وہ چھوڑ گیا تھا ایک فطری امر تھا۔ دوسرا شدید دھچکہ اسے صحن میں پہنچنے کے بعد لگا، وہ ٹھنڈی چھاؤں والا، عید کی خوشیاں بخشنے والا نیم کا درخت وہاں نہیں تھا۔ وہاں کیا وہ تو کہیں بھی نہیں تھا۔ اس نے چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر

دیکھا کہ شاید باہر کی چکا چوند نے اس کا اندر دھندلا دیا ہو مگر اسے نیم کا درخت کہیں نظر نہ آیا۔ اس نے دکھے دل کے ساتھ ماں جی کی طرف دیکھا اور ماں جی گھبرا کر فوراً توجیہہ دینے لگیں۔ "بیٹا دیکھو نا صحن میں کتنی گندگی ہو جاتی تھی۔ بچوں کی خواہش تھی کہ اسے کاٹ دیا جائے اور پھر کوئی فائدہ بھی تو نہیں تھا، بے کار کی جگہ گھیرتا تھا دیکھو اب اس کے کٹنے سے جگہ نکلی تو عابد اور واحد کے کمرے کتنے خوبصورت ہو گئے۔" ماں جی شاید اس کے دکھ کو جانتی تھیں اس لئے ہر ممکن طریقے سے اسے بہلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ جبر سے مسکرایا اور خاموشی سے آکر اپنے کمرے میں لیٹ گیا۔ اسے ایسا لگا کہ اس کی ذات کے ساتھ ساتھ یہ کائنات بھی ادھوری رہ گئی ہو۔ اس کی عید بدل گئی ہو، آج وہ بڑی تائی کی جگہ اپنے آپ کو محسوس کر رہا تھا جیسے کہ وہ بھی خوشیوں کے لمحے میں چپکے چپکے رو رہا ہو۔ آج اسے صحیح معنوں میں پتہ چلا کہ اپنے پیاروں سے بچھڑنا کیسا ہوتا ہے۔ عید تو شاید ہمیشہ جیسی ہی ہو دلچسپ اور حسین مگر لوگوں کے سوچنے کے انداز بدل جاتے ہیں، رویہ بدل جاتا ہے۔ لیکن اب اسے اپنی عید کو خود حسین بنانا ہے اپنے لئے، بالکل ویسے ہی جیسے کہ اس کی بچپن کی عید تھی۔ یہ سوچتے ہی وہ ایک نئے عزم کے ساتھ اٹھ بیٹھا۔ اور جس رات عید کے چاند کو نکلنا تھا اس رات اس کے کمرے کے آگے ایک قطارے میں چھوٹے چھوٹے بے شمار چاند نیم کے نوخیز پودے کی شکل میں طلوع ہو رہے تھے۔

دائرے ہی دائرے۔

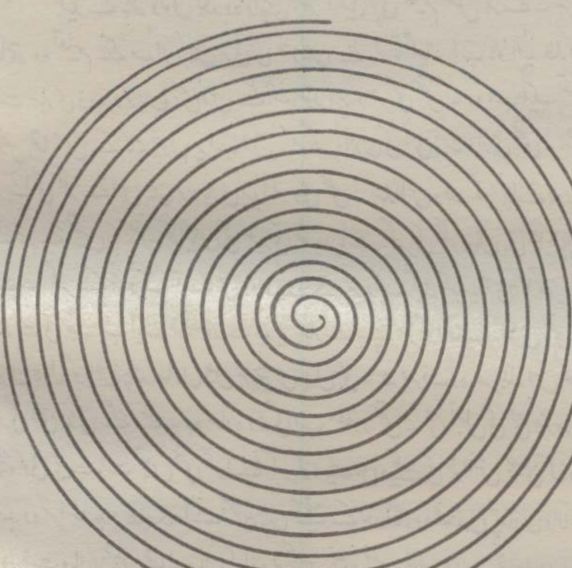

اس تصویر کو گھما کر یا بغیر گھمائے دیکھئے اور بتائیے کہ اس میں آپ کو کیا نظر آیا؟

منہ نہ بنائیے
سبزیاں بھی کھائیے

ہماری صحت کا دارومدار ہماری پسندیدہ غذاؤں پر نہیں بلکہ غذاؤں کے متوازن انتخاب پر ہے۔

گوشت، انڈے، دودھ دہی، دالیں اور چاول شوق سے کھائیے

مگر ـــــ سبزیوں سے جی نہ چرائیے

★ ـــــ سبزیاں ہمارے جسم کو بیماریوں سے مدافعت کی قوت عطا کرتی ہیں

★ ـــــ سبزیوں میں پوشیدہ قوت جزوِ خون بن کر ہمیں صحت مند رکھتی ہے

★ ـــــ سبزیاں ہلکی غذا ہونے کے باعث جلدی ہضم ہو جاتی ہیں

یوں گویا سبزیوں کا استعمال ہمارے نظامِ ہضم کو متاثر نہیں کرتا۔

★ ـــــ سبزیوں میں وٹامنز، گلوکوز اور منیرلز جیسی طاقت کے خزانے پوشیدہ ہیں

★ ـــــ سبزیاں اللہ کی بے پایاں نعمتوں میں سے ہیں

کفرانِ نعمت نہ کیجئے — سبزیاں شوق سے کھائیے — ہمیشہ صحت مند رہئے

یہ اشتہار ماہنامہ آنکھ مچولی کراچی نے بقائے صحت اور بہبود اطفال کی خاطر بطورِ خاص شائع کیا

ترانہ

ضیاء الحسن ضیاء

پیارا پاکستان ہمارا، خوشیوں کا گہوارا ہے
اس کا چپّہ چپّہ ہم کو اپنی جان سے پیارا ہے

اونچے اونچے اس کے پربت، گھاٹی، وادی، سبزہ زار
قریہ قریہ روشن روشن، گلشن گلشن چھائی بہار

ہم ہیں جگنو، چاند، ستارے ہم ہیں دنیا کے اُجیارے
پاک وطن، رنگین چمن کے ہم سے ہیں پُر نور نظارے

آپس میں ہم ایک رہیں گے پیار محبت عام کریں گے
پاکستان کی آن کی خاطر اچھے سارے کام کریں گے

سدا رکھیں گے سامنے اپنے قائد کے انمول اُصول
کمی نہ آئے گی کوشش میں، کبھی نہ ہو گی ہم سے بھول

علاج

شہاب محمود

سنی میاں آج پھر جب شام کو کھیلنے کے بعد گھر پہنچے تو پریشانی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ اور جس طرح انہوں نے اپنا بیٹ اٹھا کر بے دلی سے پھینکنے کے انداز میں رکھا تھا اس سے بھی ان کی پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ ان کی امی گزشتہ کئی دنوں سے دیکھ رہی تھیں کہ سنی میاں کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے

ہیں۔ مگر انہوں نے سنی سے پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ آج بھی جب سنی گھر میں داخل ہوئے اور بے دم ہو کر کرسی پر بیٹھ گئے تو امی نے ان سے یہ پوچھا۔

"تھک گئے ہو؟" مگر سنی نے صرف سر ہلا کر جواب دیا "نہیں۔"

"دودھ پیو گے؟" انہوں نے سنی سے پوچھا۔

"نہیں"۔ اتنا کہہ کر سنی پھر خاموش ہو گیا۔

ان کی امی نے پریشانی کے متعلق اس لئے نہیں پوچھا کہ ان کا خیال تھا کہ بچے میں یہ صلاحیت ہونی

چاہئے کہ وہ اپنے مسائل خود حل کر سکے۔ اس طرح بچے کی ذہانت اور اعتماد میں اضافہ ہوتا ہے مگر آج بات مختلف تھی۔ سنی نے گھر میں داخل ہو کر اپنا وہ بیٹ بے دلی سے کونے میں پھینک دیا تھا جو گزشتہ مہینے امتحانات میں اول آنے پر پپا نے انہیں لا کر دیا تھا۔ اور سنی اس بیٹ کے ملنے سے بہت خوش تھے اور اس کی بہت حفاظت کرتے تھے۔ ان کی امی نے سوچا کہ آج رات وہ سنی کے پپا سے بات کریں گی تاکہ وہ سنی کی پریشانی کا کوئی حل ڈھونڈ سکیں۔ اس دوران وہ سنی میاں کی حرکتوں کا بغور مشاہدہ کرتی رہیں۔ انہوں نے دیکھا کہ سنی میاں تھوڑی دیر بیٹھے رہے پھر اچانک اٹھے اور نماز کے بعد اسکول کا ہوم ورک کرنے بیٹھ گئے۔ ان کا دل کام میں نہیں لگ رہا تھا مگر وہ پھر بھی کام کرتے رہے۔ کام مکمل کرنے کے بعد وہ اٹھے تو بھی پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ پھر وہ مغرب کی نماز پڑھ کر جب واپس آئے تو بھی حالت وہی تھی۔ سنی کا ذہن کچھ سوچ رہا تھا۔ مگر کیا؟ یہ پتا نہیں تھا۔ لیکن ان کی امی نے یہ سوچ کر اطمینان کا سانس لیا کہ پریشانی ایسی نہیں ہے کہ سنی کے کام یا دوسرے معمولات پر کوئی فرق پڑا ہو۔ اس دوران پپا بھی آ گئے۔

رات کھانے سے پہلے ممی نے پپا کو سنی کی ساری کیفیت بتا دی، جس پر پپا نے کہا کہ کھانے کے بعد سنی سے بات کریں گے۔

کھانا مزیدار تھا مگر سنی میاں آج تو کھانے پر بھی خاموش خاموش سے تھے۔ بس چپ چاپ سر جھکائے کھانا کھاتے رہے۔ نہ اسکول کے دوستوں کے واقعات سنائے، نہ کھیل کی باتیں کیں۔

"ہوم ورک مکمل کر لیا؟" پپا نے تھوڑی دیر ان کی دیکھتے رہنے کے بعد پوچھا۔

"جی کر لیا۔" سنی نے صرف اتنا کہا۔

"آج تو اسکول دیر سے نہیں پہنچے؟" پپا نے اگلا سوال کر دیا۔

"جی نہیں تو۔" سنی کا جواب صرف اتنا تھا۔

کھانے کے بعد سنی چپ چاپ اٹھ کر چلا گیا۔ ممی اور پپا نے اس کو تھوڑی دیر بعد کمرے میں بلایا۔ پیار کرنے کے بعد اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ مگر سنی کو کھویا کھویا دیکھ کر انہوں نے نرمی سے پوچھا۔

"بیٹے کوئی پریشانی ہے؟"

"جی نہیں ...... نہیں تو۔"

"پھر کوئی چیز چاہئے؟" پپا نے پوچھا۔

"نہیں۔" سنی کا جواب تھا۔

"کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے؟ کوئی نقصان ہو گیا ہے؟"

"نہیں تو پپا۔"

"پھر کیا مسئلہ ہے۔ کیوں اتنے دنوں سے خاموش خاموش سے ہو؟" پپا نے دریافت کیا۔

"کچھ بھی نہیں ہے۔" سنی نے جواب دیا۔

پپا کو اندازہ تھا کہ سنی اپنی پریشانی اتنی آسانی سے نہیں بتائیں گے۔ پچھلے مہینے بھی جب ان کی اور ان کے ایک انتہائی پیارے دوست کے درمیان ایک تیسرے دوست نے غلط فہمی پیدا کر دی تھی، تو سنی پریشان ہو گئے تھے۔ انہیں بہت افسوس ہوا تھا۔ اور انہوں نے اپنے اس عزیز دوست سے ملنا جلنا ترک کر دیا تھا۔ پہلے وہ دونوں دوست کلاس روم میں ایک ہی ڈیسک پر بیٹھتے تھے مگر سنی نے اپنی ڈیسک بھی تبدیل کرالی تھی۔ مگر جب پپا نے سنی اور اس کے دوست کو آمنے سامنے بٹھا کر اس غلط فہمی کے متعلق پوچھا، تو بات کچھ بھی نہیں نکلی۔ اور معلوم ہوا کہ ان کے تیسرے دوست نے بے بنیاد بات کر کے دونوں کے درمیان غلط فہمی پیدا کی تھی۔ اس بدگمانی کو دور کرنے کے بعد پپا نے سنی کو سمجھایا تھا کہ "بیٹے بلا تحقیق دوسروں کی بات پر یقین نہیں کرتے۔ اس سے تمہیں بھی تکلیف ہوگی اور تمہارے پیارے دوستوں کو بھی۔ کوئی غلط فہمی ہو، بدگمانی ہو تو براہ راست متعلقہ فرد سے پوچھو۔ ورنہ دوسرے لوگ اچھے دوستوں کے درمیان غلط فہمیاں ہی پھیلاتے رہیں گے۔ اور پھر نہ تم کچھ کر سکو گے اور نہ کوئی دوسرا شخص۔ خواہ مخواہ غلط فہمی دوریاں پیدا کرتی ہے۔ بدگمانی دور کرنے کی کوشش عقلمندی کی نشانی ہے۔

تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد پپا نے سنی سے کہا کہ چلو بستر پر چلتے ہیں۔ وہاں باتیں کریں گے۔ بستر پر لیٹنے کے بعد پپا نے پھر سنی کو پیار کیا اور دوبارہ پریشانی کی وجہ پوچھی۔ آخر خاصی دیر بعد سنی بولے۔

"پپا اب میں کرکٹ نہیں کھیلوں گا!"

"کرکٹ نہیں کھیلوں گا، مگر کیوں بیٹے، کیا ہوا؟" پپا نے حیرانی سے پوچھا امی بھی مڑ کر سنی کی طرف دیکھنے لگیں۔

"پپا میرا نیا بیٹ بڑا منحوس ہے۔ جس دن سے وہ بیٹ آیا ہے نا مجھ سے صحیح بیٹنگ نہیں ہو رہی ہے۔ میرے سارے دوست میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔" سنی نے کہا۔

"اگر اس بیٹ سے بیٹنگ صحیح نہیں ہوتی تو پھر کسی اور پرانے بیٹ سے بیٹنگ کر لیتے۔"

"کی تھی، مگر ایک بار نئے بیٹ سے بیٹنگ کرنے کے بعد تو مسئلہ خراب ہی ہو گیا ہے۔ اب نہ نئے بیٹ سے بیٹنگ ہوتی ہے نہ پرانے بیٹ سے۔" سنی نے پھر جواب دیا۔

"بیٹے تم کچھ دن اس نئے بیٹ سے پریکٹس تو کرو۔ آہستہ آہستہ وہ بیٹ تمہارے ہاتھ پر سیٹ ہو جائے گا۔" پپا نے مشورہ دیا۔

سنی میاں کچھ سوچ میں پڑ گئے پھر اچانک بولے "مگر میں پرانے بیٹ سے تو اتنے دنوں سے بیٹنگ کر رہا ہوں مگر اس سے بھی تو صحیح بیٹنگ نہیں ہو رہی ہے۔"

"بیٹے ہو سکتا ہے کہ مسئلہ یہ ہو کہ تم نے نئے بیٹ سے جب بیٹنگ کرنی شروع کی تو وہ تمہارے ہاتھ پر سیٹ نہیں تھا۔ اس کی بہت ساری وجوہ ہو سکتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا وزن یا لمبائی پرانے بیٹ سے کم یا زیادہ ہو۔ اس کے ہینڈل کی گرپ سے ابھی تمہارے ہاتھ مانوس نہیں ہوئے ہوں۔ یا اس کے علاوہ کوئی اور ایسی وجہ ہو سکتی ہے۔ جس کا حل بہر حال تلاش کیا جا سکتا ہے۔" پپا نے سنی کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"ہاں پپا یہ ہو سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کا وزن دوسرے پرانے بیٹ سے تھوڑا سا زیادہ ہے۔" سنی نے کہا اور پھر اچانک پپا سے پوچھنے لگے،۸

"پپا کیا پریکٹس کے بعد وہ بیٹ میرے ہاتھ پر سیٹ ہو جائے گا؟"

پپا نے جواب دیا۔ "ہاں ہاں کیوں نہیں۔ تمہارے ہاتھ اس کی گرپ سے، اس وزن کے سے جب مانوس ہو جائیں گے تو تمہاری بیٹنگ دوبارہ صحیح ہو جائے گی۔"

"ہاں پپا اب میں ایسا ہی کروں گا۔ میں غلط سوچ رہا تھا۔" سنی کی آنکھیں دوبارہ چمکنے لگیں۔ چہرہ ایک دم نکھر گیا۔ اور سنی اپنے بستر پر جانے لگے۔ تو پپا نے پوچھا "اچھا یہ بتاؤ تم سے کس نے کہا کہ بیٹ منحوس ہے؟"

"میرے دوست نے۔" سنی نے بتایا پھر تھوڑی دیر بعد دوبارہ بولا۔

"دراصل جب سے نیا بیٹ آیا ہے۔ میں مسلسل جلدی آؤٹ ہو رہا ہوں۔ تو میرے دوست میرا مذاق اڑانے لگے۔ میرے ایک دوست نے کہا کہ تمہارا یہ نیا بیٹ منحوس ہے۔"

"دیکھو بیٹے!" پپا سنی کو سمجھانے کے انداز میں بولنے لگے۔

"چیزیں منحوس نہیں ہوتیں۔ یہ ہمارا وہم ہوتا ہے۔ ذرا سوچو وہ چیزیں کیسے منحوس ہو سکتی ہیں جنہیں ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ چیزیں ہمارے لئے بنی ہیں۔ تاکہ جیسا ہم چاہیں انہیں استعمال کر سکیں۔ چیزوں نے ہمیں نہیں بنایا کہ وہ ہماری اچھی یا بری کارکردگی کی وجہ ہو جائیں یا قسمت کے فیصلے کرنے لگیں۔ ہاں کسی کام کے لئے صحیح چیز کا انتخاب دوسری بات ہے۔ اگر آدمی خود محنتی اور عقلمند ہو تو وہ ان ساری نحوستوں کو دور کر سکتا ہے۔ اور جس آدمی میں عقل اور محنت کی خوبیاں نہیں ہیں۔ وہ

اپنی خراب کارکردگی کا مورد الزام دوسرے افراد کو، دوسری چیزوں کو ٹھہرانے لگتا ہے۔ صرف اپنی صلاحیتوں پر اعتماد کرو اور چیزوں کا صحیح استعمال سیکھو۔ کوئی چیز منحوس نہیں رہے گی۔ وہم پاس بھی نہیں پھٹکے گا۔"

سنی میاں ایک دم سر ہلانے لگے اور بولے۔ "پپا آپ واقعی صحیح کہہ رہے ہیں۔ آپ نے کام کی بات بتائی ہے۔" پھر انہوں نے امی اور پپا کو پیار کیا اور بستر کی جانب جانے لگے تو پپا نے انہیں ایک بار پھر روکا اور کہنے لگے۔

"اور ہاں سنی بیٹے یہ جو چھوٹی چھوٹی رکاوٹیں آجائیں نا تو راستہ نہیں بدل لینا چاہئے۔ پوری قوت سے اسی راستے پر آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہئے کیا سمجھے؟"

"سمجھ گیا" سنی بولا۔

"اب مجھ سے خراب بیٹنگ ہوئی تو کرکٹ چھوڑنے کا نہیں سوچوں گا۔ یہی بات ہے نا پپا؟"

"ہاں بالکل یہی بات" پپا نے مسکرا کر کہا۔ تب ہی امی پپا سے کہنے لگیں۔

"میرا سنی سوچتا بھی ہے۔ اور صحیح بات سمجھانے پر سمجھ بھی جاتا ہے۔"

"آخر بیٹا کس کا ہے!"

پپا کی اسی بات پر کمرہ دونوں کے قہقہوں سے گونج اٹھا۔

...... □ ......

مشورہ

ایک مقدمے میں سرکاری وکیل کے بیانات سننے کے بعد جج نے ملزم کے وکیل سے کہا کہ اگر وہ چاہے تو ملزم کو الگ سے لے جا کر اسے مزید کارروائی کے سلسلے میں مناسب ترین مشورہ دے سکتا ہے یہ سن کر وکیل، ملزم کے ساتھ ایک طرف کو چلا گیا۔ چند لمحے کے بعد وہ اکیلا واپس آیا تو جج نے اس سے پوچھا۔ "ملزم کہاں ہے۔"

وکیل نے جواب دیا "وہ تو بھاگ گیا۔ میں اسے مناسب ترین مشورہ یہی دے سکتا تھا۔"

ہمپرے کو بچالیا گیا

شگفتہ شمیم

وہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۵ء کا ایک خوبصورت اور گرم دن تھا۔ ہمپ بیک نامی وہیل مچھلیوں کا ایک گروپ بحرالکاہل کے گہرے پانی میں اپنے سفر پہ رواں دواں تھا۔ یہ گروپ چار پانچ چھوٹی بڑی وہیل مچھلیوں پر مشتمل تھا۔ ان میں ہمپرے نامی ایک وہیل تیرتا ہوا اپنے ساتھیوں سے آگے نکل گیا اور سان فرانسسکو شہر کو امریکا کی دوسری ریاستوں سے ملانے والے مشہور گولڈن گیٹ برج کو پار کرتا ہوا ساحلی علاقے کی طرف جانکلا۔

وہ دن سان فرانسسکو کے ان شہریوں کے لئے بہت یادگار تھا جو ساحلی علاقے میں سیر وتفریح کے لئے آئے تھے کیونکہ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی اتنی بڑی وہیل نہیں دیکھی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ہمپرے کا قد تقریباً ۴۵ فٹ اور وزن ۴۰ ٹن کے قریب تھا۔ جب وہ سانس لینے کے لئے سطح

سمندر پر نمودار ہوتا تو خوف اور حیرت سے لوگوں کی چیخیں نکل جاتی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ساحل سمندر لوگوں کے ہجوم سے بھر گیا مگر بعد میں آنے والوں کی قسمت اتنی اچھی نہیں تھی کیونکہ ہمپبرے لوگوں کو حیرت زدہ چھوڑ کر آگے بڑھ چکا تھا۔

ہمپبرے نے وہ غلطی کر ڈالی جو عام طور پر وہیل مچھلیاں نہیں کرتی ہیں۔ وہ واپس کھلے سمندر کا رخ کرنے کے بجائے "سکرامنٹو" دریا کی طرف بڑھ گیا جو اس کے لئے موت کا راستہ تھا۔ جوں جوں ہمپبرے آگے بڑھتا گیا توں توں دریا مزید تنگ ہوتا گیا۔ دریا کے کنارے موجود لوگ حیرت سے اسے دیکھتے تھے سب جانتے تھے کہ ہمپبرے غلط راستے پر جارہا ہے مگر یہ بات ان کی سمجھ سے بالاتر تھی کہ کس طرح اسے کھلے سمندر میں واپس بھیجا جائے۔

اس طرح ہمپبرے سکرامنٹو دریا میں کئی دنوں تک تیرتا رہا اور تقریباً ۶۴ کلومیٹر تک کا فاصلہ طے کر ڈالا۔ بالآخر وہ ایک چھوٹے سے پل کو بھی کراس کر گیا۔ اب وہ اور بھی چھوٹے دریا میں داخل ہوچکا تھا۔ یہ میٹھے پانی کا ایک چشمہ تھا جو کھیتی باڑی کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ یہ صورتحال اس کے لئے اور بھی خطرناک تھی کیونکہ وہیل مچھلیاں نمکین پانی میں زندہ رہنے کی عادی ہوتی ہیں۔ اگر کوئی وہیل مچھلی میٹھے پانی میں زیادہ عرصہ تک رہے تو مرجاتی ہے۔ اب ہمبرے کے لئے موت یقینی تھی۔ مگر کنارے پر موجود لوگ، ہمپبرے کے دوست، اسے مرتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہر شخص بے چین تھا کہ کس طرح ہمپبرے کی جان بچ جائے۔ چنانچہ سائنس دانوں، کوسٹ گارڈز اور یہاں تک کہ عام شہری بھی ہمبرے کو بچانے کے لئے سوچ بچار میں مصروف ہوگئے۔

آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ دریا کی جانب سے ڈھول باجے بجا کر ہمپبرے کو اس قدر خوفزدہ کر دیا جائے کہ وہ اپنے راستے پر واپس جانے پر مجبور ہوجائے۔ ان کی اس کوشش کا خاطر خواہ اثر ہوا اور آوازوں کے شور سے گھبرا کر ہمپبرے نے واپسی کا رخ کیا۔ مگر پل تک پہنچ کر وہ رک گیا۔ شاید اسے پل کو سہارا دینے والی لکڑیوں کے درمیان بنے ہوئے راستے سے گزرنا ناممکن لگ رہا تھا۔ اب اس نے غصے میں اپنی دم کو زور زور سے پٹخنا شروع کر دیا۔ لوگ ایک مرتبہ پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ پھر فیصلہ ہوا کہ کچھ پرانی لکڑیوں کو کاٹ کر اتنی جگہ بنالی جائے جس کے ذریعے ہمپبرے کا دیوہیکل جسم باآسانی گزر سکے۔

تمام رات کرین کی مدد سے لکڑیوں کو کاٹا جاتا رہا۔ دوسرے دن پھر لوگوں نے ڈھول ڈرم پیٹنا شروع کر دیا۔ مگر ساتھ وہ یہ بھی سوچ رہے تھے کہ آیا ہمپبرے اس فرق کو محسوس کر سکے گا؟ اس نے دوبارہ پل کا رخ کیا۔ نزدیک پہنچ کر ایک لمحے کو رکا اور دوسرے لمحے وہ پل کی دوسری جانب تھا۔ خوشی اور مسرت سے لوگ چیخ پڑے۔ ہمپبرے نے واپسی کا سفر شروع کیا تو لوگ بھی اس کے ساتھ ساتھ راستے کی

صحیح رہنمائی کے لئے چل پڑے۔ آگے آگے ہمپرے اور پیچھے پیچھے کوسٹ گارڈز اور لوگوں کی شور مچاتی کشتیاں۔

۴ نومبر ۱۹۸۵ء کو یعنی پورے ۲۳ دن کی جدوجہد کے بعد ہمپرے صحیح سلامت سان فرانسسکو کے ساحلی علاقے میں پہنچ چکا تھا۔ اس دن بھی لوگ اسے آخری بار دیکھنے کیلئے ساحل سمندر پر جمع تھے۔ ہمپرے سارا دن پانی میں اچھل کود کر انہیں محظوظ کرتا رہا۔ شام کے وقت اس نے آخری بار سطح سمندر پر نمودار ہو کر اپنے دوستوں اور محسنوں کو دیکھا اور گولڈن گیٹ برج کو کراس کرتا ہوا گہرے پانی میں گم ہو گیا۔

بلاشبہ ہمپرے نے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ امریکا کے وہ شہری بھی قابل تحسین ہیں جنہوں نے اپنی کوششوں سے ایک قیمتی وہیل کی جان بچائی تھی۔

○○○○

کچھ ہمپ بیک وہیل کے بارے میں!!

ہمپ بیک وہیل مچھلیوں کا شمار دنیا کی سب سے بڑی بلیو وہیل کے بعد دوسرے نمبر پر ہوتا ہے جو تقریباً باسٹھ فٹ لمبی اور پچاس ٹن وزنی ہوتی ہیں۔ یہ اپنے سولہ فٹ لمبے فلیرز (مچھلی کا چوڑا جس کی مدد سے تیرتی ہے) کی وجہ سے فن وہیل (   ) بھی کہلاتی ہیں۔ یہ دنیا کے تمام بڑے سمندروں میں پائی جاتی ہیں اور ہمیشہ چار یا پانچ کے گروپ میں سفر کرتی ہیں۔ اس وہیل کی ایک دلچسپ خصوصیت یہ ہے کہ سمندر میں اپنے سفر کے دوران کئی کئی گھنٹوں تک گانا گاتی رہتی ہیں۔

افزائش نسل کے زمانے میں ہمپ بیک وہیل مچھلیاں گرم سمندروں کا رخ کرتی ہیں۔ بچہ پیدا ہونے کے بعد تقریباً ایک سال تک ماں کا دودھ پیتا ہے۔ اس وقت تک اس کے جبڑے اتنے مضبوط ہو جاتے ہیں کہ یہ خود سمندر کے چھوٹے چھوٹے جانوروں اور مچھلیوں کا شکار کر کے اپنے لئے خوراک حاصل کرنا شروع کر دیتا ہے۔

شیر بنانے والے

شان الحق حقی

آیئے آج ہم آپ کو "پنچ تنتر" میں سے ایک کہانی سناتے ہیں۔ پنچ تنتر (تن تر) سنسکرت زبان کی ایک مشہور کتاب ہے، جو بہت قدیم زمانے میں لکھی گئی تھی۔ اس میں بڑی دلچسپ چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہیں جن سے ہم بہت کچھ عقل بھی سیکھ سکتے ہیں۔

کہتے ہیں کسی بستی میں تین برہمن رہتے تھے۔ یعنی ہندو عالم، جو بہت سا علم پڑھے ہوئے تھے اور بڑے جادو کر کے دکھا سکتے تھے۔ جادو تو دراصل علم ہی کا نام ہے۔ اسی کو سائنس کہتے ہیں جس نے ہمارے زمانے میں ایسے ایسے کمال کر دکھائے ہیں کہ ان کے سامنے جادو منتر کوئی چیز نہیں۔ کمال بھی اصلی اور حقیقی نہ کہ صرف خیالی۔

ان برہمنوں نے سوچا کہ ایک دُور کے راجہ کے پاس جائیں جو عالموں کا بڑا قدر دان تھا، اور سفر پر روانہ ہو گئے۔ راستے میں ایک جنگل سے گزرے جہاں ایک شیر کا ڈھانچا پڑا ہوا ملا۔ انہوں نے آپس میں کہا کہ اس مرے ہوئے شیر کو پھر سے سالم شیر کیوں نہ بنا دیا جائے۔ اسے تحفے کے طور پر بادشاہ کے پاس لے جائیں گے تو وہ خوش ہو گا اور ہمارے علم کا لوہا مانے گا۔

انہوں نے اپنا عمل شروع کیا، ڈھانچے پر گوشت پوست چڑھایا۔ شیر اپنی اصل شکل میں آگیا، اب اسے صرف چالو کرنا تھا یعنی بس جان ڈالنے کی کسر تھی جیسے ہی انہوں نے جان ڈالنے کے لئے منتر پڑھنے شروع کئے ایک ساتھی نے کہا۔ "ٹھہرو! بھائیو... یہ بھی سوچ لو کہ یہ شیر اٹھے گا تو بہت بھوکا ہو گا اور ہم تینوں کو ہڑپ کر جائے گا۔ اس کے ساتھیوں نے کہا۔ "مگر بھئی اب اتنا کچھ کر لینے کے بعد کام کو ادھورا تو نہیں چھوڑا جا سکتا ساری محنت اکارت جائے گی۔ شیر کو تو چالو کرنا ہی ہو گا ہم اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی محنت کا نتیجہ بھی تو دیکھیں آخر تیسرے ساتھی نے کہا کہ بس اتنی دیر رک جاؤ کہ میں درخت پر چڑھ جاؤں پھر تم شیر کو چالو کرتے رہنا۔

وہ تو درخت پر چڑھ گیا، ادھر ان دونوں نے شیر کے دل کی دھڑکن اور سانس جاری کیا، اور شیر نے آنکھیں کھولیں۔ ابھی یہ اپنے کارنامے پر مسکرا ہی رہے تھے کہ شیر غرّا کے ان پر جھپٹا اور دونوں کو چٹ کر گیا۔ یوں تو یہ ایک خیالی کہانی ہے مگر اس میں ایک گر کی بات بھی ملتی ہے یعنی علم کے ساتھ انسان کو عقل سے بھی کام لینا چاہئے۔ آگے کی بھی سوچنی چاہئے جسے دور اندیش کہتے ہیں ہمارے زمانے میں سائنس دانوں نے اپنی حکمت کا کرشمہ دکھانے کے لئے ایٹم بم جیسا خوفناک ہتھیار بنا ڈالا۔ اب دنیا میں اتنے بم بنے رکھے ہیں کہ برہمنوں کے شیر کی طرح چالو کر دئے جائیں تو دنیا کی ساری آبادی کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک کئی بار تباہ کر سکتے ہیں۔ خدا خیر رکھے اور انسان اپنے ہی علم کے ہاتھوں تباہ ہونے سے بچ جائے۔

تضاد

یہ پچھلے دنوں کی بات ہے، ہماری مس مسز سجاد نے ہمیں مذہبِ اسلام کے بارے میں کافی بڑا لیکچر دیا اور بتایا کے دوسرے علوم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم حاصل کرنا بھی بہت ضروری ہے۔ اگلے دن ہمارے اسکول میں پارٹی تھی میں کسی ضروری کام سے اسٹاف روم میں گیا تو دیکھا مسز سجاد کا بیٹا، جس کی عمر یہی کوئی چار پانچ سال کے قریب ہو گی، دوسری ٹیچرز کو انگلش کی کوئی نظم سنا رہا تھا۔ اتنے میں قریب بیٹھی ہوئی ایک ٹیچر نے کہا، بیٹا ذرا پہلا کلمہ تو سناؤ" بچّے نے جب یہ سنا تو حیرت سے ان کا منہ دیکھنے لگا جیسے کوئی نئی بات سنی ہو۔ مسز سجاد ہنس کر بولیں "دراصل بات یہ ہے یہ ابھی بہت چھوٹا ہے۔"

میں یہ سنتے ہی وہاں سے واپس آگیا اور سوچتا رہا کے ہمارے قول و فعل میں اتنا تضاد کیوں ہے۔

Montgomery
tea time
Montgomery
Montgomery
Montgomery
The Height of Delight!

آنکھ مچولی ویڈیو میگزین

کراچی میں ہونے والی ریکارڈنگ کے چند مناظر

جمشید انصاری اور حنیف راجہ، ڈرامہ سیکرٹ ایجنٹ میں

شہریار، نداخان کے سوالوں کے سامنے

آنکھ مچولی کا تعارف پیش کرتی ہوئی نزہت ناظر علی

جلدی جلدی قدم اٹھائیں ہم رکنے نہ پائیں، ارشد محمود اور بچے

گہرے سمندر میں سفر کر رہے ہیں ہم، ۱۰ سالہ شہریار

ارشد محمود نغمہ ریکارڈ کراتے ہوئے

وڈیو میگزین کے دو کردار ، بھائی بھلکڑ اور باجی تبولی

آنکھ مچولی کی وڈیو میگزین کی رام کہانی

سلیم مغل

قارئین کی ڈاک سے، بچوں کی زبان سے اور خلقِ خدا سے ہم نے جب کبھی آنکھ مچولی کی تعریف سنی، ہم خوشی سے پھول پھول گئے۔ خوشی کیوں نہ ہو۔ لکھنے کا یہی تو ایک صلہ ہوتا ہے، چند الفاظ محبت کے دو میٹھے بول۔ اور بھلا ہو بھی کیا سکتا ہے......؟

آنکھ مچولی کی تعریف کرتے ہوئے قارئین اکثر جو بات لکھتے ہیں، وہ ہوتی ہے، اس میگزین میں اچھوتے خیال، نت نئے آئیڈیاز اور دوسروں سے مختلف انداز میں کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کا عمل۔ تصویریں ہوں یا تحریریں، آنکھ مچولی کا انوکھا پن ہر جگہ نظر آتا ہے۔

یہ ساری باتیں آنکھ مچولی کی تعریف ہی تو نہیں، قارئین کا تقاضہ بھی تو ہے کہ ہم ایسے اچھوتے آئیڈیاز پیش کرتے رہیں ...... اور یہ تعریف گویا ایک طرح کا اعتماد بھی ہے کہ ہم ایسا کرتے رہیں گے۔ آنکھ مچولی کو اچھے سا اچھا دیکھتے رہنا ہمارے قارئین کا مان ہے اور اس مان کا بھرم رکھنا ہماری ذمہ داری۔

ہر ماہ آنکھ مچولی پیش کرتے رہنا تو ہماری

مزاحیہ خبریں سناتے ہوئے ، ثناء دادر اور احمد صلاح الدین

ذمہ داری تھی ہی اور ہم اس ذمہ داری کو پورا کر بھی رہے ہیں مگر ایک بات جو ہمیشہ ذہن میں رہتی تھی وہ تھی ...... کچھ اور ...... کچھ اور...... ابھی کچھ اور ۔

"کچھ اور ......" کا جواب جو ہم نے مل جل کر تلاش کیا وہ تھا...... ملک بھر کے طالب علم ساتھیوں ، بچوں اور اہل خانہ کے لئے "ایک خوبصورت سا وڈیو میگزین" ۔

اکثر ساتھی ہمیں خط لکھ کر پوچھا کرتے تھے کہ "بچوں کے بور ٹی وی پروگرام اور وی سی آر پر فلموں کی بھرمار کے ہوتے ہوئے بچے کیا دیکھیں؟

چونکہ بچوں کے اس سوال کا جواب بھی ہم پر قرض تھا اس لئے ہم نے "آنکھ مچولی وڈیو میگزین" بنانے کا حتمی فیصلہ کر ہی لیا۔

وڈیو میگزین کا خیال بنیادی طور پر آنکھ مچولی کے مدیر اعلیٰ کا تھا۔ خیال ہی نہیں، ان کا شوق بھی تھا۔ اس شوق کی تکمیل کے لئے، ان کی نظر انتخاب جن دو لوگوں پر پڑی ، وہ دونوں ہی پاکستان ٹیلی ویژن سے جانگلوس کی طرح بھاگے ہوئے لوگ تھے۔ آپ ان دونوں کو جانتے ہیں۔ ان میں سے ایک اظہر نیاز ہیں جو ہر ماہ آپ کے لئے قسط وار ناول "کرشمہ" تحریر کرتے ہیں اور دوسرے کا نام ...... چلئے چھوڑیئے، رہنے دیجئے...... ایسا نہ ہو کہ آپ ان صاحب کو اپنا تعارف آپ پیش کرنے کے جرم میں بُرا بھلا کہنے لگ جائیں۔

اظہر نیاز، پاکستان ٹیلی ویژن اسلام آباد اسٹیشن اور ریڈیو پاکستان حیدر آباد پہ پروڈیوسر رہ چکے ہیں۔ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد میں آڈیو ویژول شعبے کے انچارج بھی رہے ہیں۔ اچھے لکھاری ہیں کئی کتابوں کے مصنّف اور بہت سے پروگراموں کے پروڈیوسر ہیں۔ آنکھ مچولی میں "دھماکہ" کے عنوان سے ان کا ناول شائع ہو چکا ہے۔ موصوف نمبر ۲ بھی کراچی ٹیلی ویژن پر ۴ سال گزارنے کے بعد مفرور ہیں۔

آنکھ مچولی وڈیو میگزین کی تیاری میں جن

باتوں کا خاص خیال رکھا گیا ان میں نمایاں یہ تھیں۔

○ ...... یہ وڈیو میگزین ملک بھر کے مختلف علاقوں میں جاکر ریکارڈ کیا جائے تا کہ اس میں سوھنی دھرتی کے سارے رنگ سما جائیں۔

○ ...... ملک بھر کے معروف اداکار بھی اس میں شامل ہوں اور باصلاحیت بچے بھی پھر یہ بھی کہ یہ کسی اچھے رسالے کی طرح مختلف نوعیت کے موضوعات کااحاطہ کرتاہوا میگزین ہو جسے فیملی کے سبھی ممبرز یکساں طور پر دیکھنا پسند کریں۔

چند بنیادی اور اہم باتیں طے کر لینے کے بعد ہم نے اس کام کا آغاز کرنا چاہا تو اس میدان میں پہلے سے موجود لوگوں نے ہمیں اس کام سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لوگوں نے ہمیں سمجھایا کہ یہ سراسر خسارے کا سودا ہے۔ مارکیٹ میں موجود بہت سے دوکاندار کیسٹ خریدنے کے بجائے، اس کی نقل کر لیں گے اور یوں ہمیں بہت سا مالی نقصان ہو جائے گا...... مگر ہم نے کسی کی ایک نہ مانی۔ مان لیتے تو یہ وڈیو میگزین کیسے تیار ہوتا۔

یہ طے پاگیا کہ اظہر نیاز پشاور، اسلام آباد اور لاہور کی ریکارڈنگ مکمل کریں گے جبکہ کراچی کی ذمہ داری ان ناتواں کاندھوں پر آن پڑی۔

ریکارڈنگ شروع ہوگئی اور ایسی شروع ہوئی کہ پھر ختم ہونے میں ہی نہ آئی ...... ہم ہر ماہ اعلان کرتے رہے کہ "بس اب اگلے ماہ وڈیو میگزین آیا ہی چاہتا ہے"۔ اگلا ماہ تو ہر ماہ آتا رہا مگر وڈیو میگزین نہ آیا۔ خود ہم بھی کئی تلخ تجربات سے گزرے اور اندازہ ہوا کہ ٹی وی اسٹیشن میں رہتے ہوئے کوئی پروگرام کرنا کتنا آسان

ڈرامہ سیکرٹ ایجنٹ کا ایک منظر

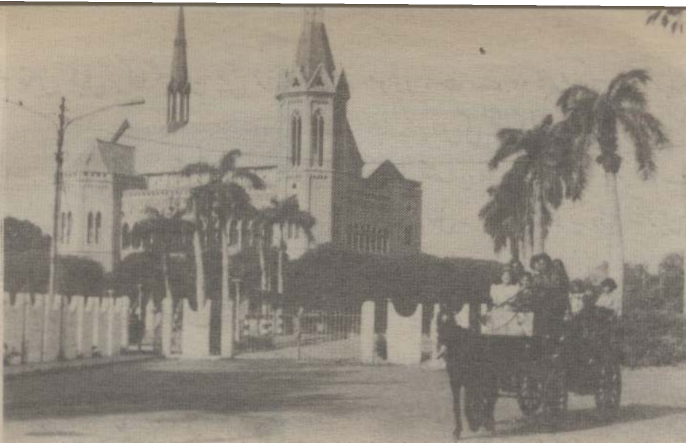

وکٹوریہ میں
۔ سرا بچے اور
رشد محمود باغ
ح کے سامنے

ہے اور ٹی وی سے ہٹ کر پروڈکشن کرنا، کس قدر
شکل۔ یوں بھی یہ ساری ریکارڈنگ شادی والے
روں سے تو کی نہیں جاتی۔ بہت ہی اعلیٰ، نفیس
قیمتی کیمروں کے ذریعہ ہونے والی ریکارڈنگ پر
چ کتنا اٹھتا ہے، یہ علیحدہ ایک دکھ بھری کہانی
ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ ڈھائی گھنٹے کی اس
ٹ پر ایک دو نہیں کئی لاکھ روپے خرچ
گئے۔

لاکھوں روپوں کا خرچ، کئی مہینوں کے جتن
نہ جانے کتنے رتجگوں کے بعد جو وڈیو میگزین ہم
، آپ کے لئے تیار کیا ہے آپ تو اسے ایک
ن بے نیازی سے دیکھیں گے اور گردن جھٹک کر
ا یا برا کہتے ہوئے ٹی وی کے سامنے سے اٹھ
ں گے ...... مگر آپ نہیں جانتے کہ کسی بھی
ن کا سفر کتنا دشوار ہوتا ہے کتنا کٹھن اور کتنا تھکا
نے والا۔

آپ سوچتے تو ہوں گے کہ آخر اس
، سے بلی باہر کیوں نہیں آتی اور یہ کہ اس
پنڈورا بکس سے آخر کچھ نکلے گا بھی یا نہیں؟
اور اگر نکلے گا تو کیا؟ آپ کا تجسس بے معنی نہیں،
اس تجسس کا اپنا لطف ہے...... بقول شاعر

لاکھوں طرح کے لطف ہیں اس اضطراب میں

ہم آپ کو یہ نوید سنا رہے ہیں کہ وڈیو میگزین اپنی تدوین کے بعد ریلیز کے لئے بالکل تیار ہے اور صرف تقسیم یا ترسیل کے طریقۂ کار کا طے ہوتے ہی مارکیٹ کر دیا جائے گا۔ بس چند روز کا انتظار۔ توقع ہے کہ مئی میں کسی وقت آپ اسے دیکھ سکیں گے۔ انشاء اللہ۔

اس وڈیو میگزین میں کیا کچھ ہے؟ سب کچھ تو نہیں البتہ کچھ کچھ مختصراً ہم آپ کو بتائے دیتے ہیں۔

سیکرٹ ایجنٹ ۰۰۶½

یہ کراچی میں ریکارڈ ہونے والا ۲۰ منٹ دورانئے کا ایک مزاحیہ ڈرامہ ہے جسے اطہر شاہ خان (جیدی) نے تحریر کیا ہے۔ دو بیوقوف جاسوس ڈاکٹر لیس، اور ڈاکٹر نو کا کردار مشہور ٹی وی

آرٹسٹ جمشید انصاری اور اسٹیج آرٹسٹ حنیف راجا نے ادا کیا ہے۔ ٹی وی آرٹسٹ لطیف منّا اور بچوں میں مینیشرا، بہار اور شہریار نے اپنے اپنے کرداروں کو خوب خوب نبھایا ہے۔ ڈاکٹر یس اور ڈاکٹر نو اطہر شاہ خان کے پرانے کردار ہیں جو یہاں نئی کہانی کے ساتھ جلوہ گر ہوئے ہیں۔

اڑنے والی کار

یہ بھی تقریباً ۲۰ منٹ دورانیئے کا کھیل ہے جسے اظہر نیاز نے لاہور میں ریکارڈ کیا۔ احمد داؤد کے تحریر کردہ اس کھیل میں ایک ذہین بچہ آپ کو اڑنے والی کار پہ بیٹھا ہوا، آسمان کی بلندیوں پر نظر آئے گا۔ لاہور کے تفریحی اور تاریخی مقامات بھی اس خوبصورت کھیل کا حصّہ ہیں۔ ٹی وی کے معروف اداکار ظلّ سبحان اور نگہت بٹ اس کھیل کے مرکزی کردار ہیں۔

خاکے

وڈیو میگزین کے زیادہ تر خاکے پشاور میں ریکارڈ ہوئے ہیں۔ ان خاکوں کو خواجہ نجم الحسن نے تحریر کیا اور ٹی وی کے معروف اداکاروں نے اس میں حصہ لیا ہے۔ ۵۵ منٹ دورانیئے کے یہ خاکے دیکھ کر آپ مسکرائے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ ایک خاکہ کراچی کے اسکول کے بچوں نے بھی پیش کیا ہے جس کا نام ہے "رکشے والا"۔

نغمے

کراچی سے ایک خوبصورت نغمہ مشہور ٹی وی سنگر ارشد محمود اور بچوں نے پیش کیا ہے جس کے بول ہیں

جلدی جلدی قدم بڑھائیں ہم رکنے نہ پائیں
آگے بڑھتے جائیں ساتھی، آگے بڑھتے جائیں

نغمے کی دھن ٹی وی کے مشہور موسیقار جاوید اللہ د... نے تیار کی ہے جبکہ یہ نغمہ انہی ہاتھوں نے لکھا ... جن ہاتھوں کا لکھا آپ کو اس وقت بھی برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔

نغمے کی خوبصورتی اس کی خوبصورت لوکیشن ہیں اسے کراچی کے سمندر (مرینا کلب)، باغ جناح مزار قائد، اور لائبریری وغیرہ میں ریکارڈ کیا گیا... اور اسے بہت سے پیارے پیارے بچوں نے ارشد محمود کے ساتھ خوشگوار موڈ میں ریکارڈ کرایا ہے۔

○ ...... اسلام آباد کے بچوں نے ایک خوبصورت قوالی بھی پیش کی ہے، اس قوالی میں بچوں کا جھومنا جھامنا، بلکہ عالم وجد میں آجانے وا... کیفیت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ قوالی موضوع، بچے، امتحان، اور نقل وغیرہ ہیں۔

○ ...... کراچی ہی میں عبدالرحمٰن ڈاڈا گروپ ... بہت سے بچوں بڑوں نے مل کر ایک قبائلی رقص پیش کیا ہے۔ یہ رقص رات کے وقت جنگل میں ریکارڈ کیا گیا۔ رات کا منظر، جنگل اور پھر آ... خور قبیلے کے لوگ آپ خود ہی سوچ لیجئے رقص کیسا خوف ناک ہوگا۔ اس کی خوفناک موسیقی بھی جاوید اللہ دتہ نے دی ہے جبکہ خوفنا... آوازیں ارشد محمود اور جدید آلات مشترکہ کمال ہیں۔ اس رقص کی ہدایات ابراہیم ...

نے دِی ہیں۔

ذہین بچے

کھلے سمندر میں پانچویں جماعت کے طالب علم شہریار کو کشتی چلاتے دیکھ کر آنکھیں واقعی حیرت سے پھٹی رہ جاتی ہیں۔ اس قدر بہادر بچے کو دیکھنے اور اس کی باتیں سننے کا جی تو آپ کا بھی چاہے گا۔ ندا طارق نے شہریار اور اس کے امی ابو سے جو گفتگو کی ہے وہ ہم سب کو بڑے کام کرنے کے لئے ہمت اور حوصلہ عطا کرتی ہے۔

○...... منیزا لمحمود ۱۲ سالہ بچی ہے مگر اس کے بال فرش کو چھوتے ہیں۔ منیزا لمبے بالوں کا ورلڈ ریکارڈ قائم کرنا چاہتی ہیں۔ آپ ان سے اس کیسٹ میں ملاقات کر سکتے ہیں۔

مشاغل

ایک صاحب کا دعویٰ ہے کہ ان کے پاس ماچسوں کا اتنا بڑا خزانہ ہے کہ شائد ہی کسی کے پاس ہو۔ لیاقت علی خان کی ماچس، ضیاء الحق اور دیگر مشہور لوگوں کی ماچسیں، دنیا بھر کے ملکوں کی عجیب و غریب ماچسیں، یہ سب کچھ آپ وڈیو میگزین میں دیکھ سکیں گے۔

گھروں سے بھاگ جانے والے بچوں کے انٹرویو، تصویروں کی نمائش، کھیل کراٹے، اشفاق صاحب کی سمجھ میں نہ آنے والی بولی، دو نئے کردار بھائی بھلکڑ اور باجی تبولی، مزاحیہ خبریں اور...... اور بھی بہت کچھ ہے اس میگزین میں...... سبھی کچھ ہم نے آپ کو ابھی سے بتا دیا تو پھر آپ دیکھیں گے کیا؟ ہمیں امید ہے کہ آپ وڈیو میگزین دیکھنے کے بعد اپنی اچھی یا بری رائے سے ہمیں ضرور آگاہ کریں گے۔ آپ کی رائے آئندہ ایک بہتر وڈیو میگزین کی تیاری میں ہماری مدد گار ہوگی۔

ہم سے تو جو کچھ بن پڑا ہم نے کر دیا۔ اب آپ جو کچھ کہہ سکتے ہیں کہہ لیجئے ہم سن لیں گے۔

اب جس کے جی میں آئے وہی پائے روشنی
ہم نے دیا جلا کے سر عام رکھ دیا

سلّو میرا دوست ہے

منیر احمد راشد

اس کو دیکھتے ہی شارب کے ذہن میں سب سے پہلے بھالو کا خیال آیا تھا۔ کالا رنگ، ماتھے پر جھکے ہوئے سیاہ بال، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، پھیلی ہوئی ناک اور موٹے ہونٹ۔ اس پر سیاہ گرم چادر جسم پر لپیٹے جیسے ہی سلو، ریل گاڑی سے اترا، شارب کے ذہن میں ہلکی سی سرگوشی ابھری،...... بھالو...... اور اس کے ساتھ ہی اپنے بہترین دوست سے پہلی ملاقات کی خوشی کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر، پانی کے جھاگ کی طرح بیٹھتا چلا گیا۔

شارب اور سلّو کی دوستی تقریباً دو سال پرانی تھی۔ جب شارب کے ابو دو سال کے لئے سعودی عرب چلے گئے تو شارب ایک دم تنہا ہو گیا تھا۔ حالانکہ وہ کافی بڑا ہو چکا تھا اور آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا مگر اب بھی وہ کسی ننھے بچے کی طرح ابو سے پیار کرتا تھا۔ ابو بھی اس سے اکلوتا ہونے کی وجہ سے بہت پیار کرتے تھے۔ وہ دونوں باپ بیٹے سے زیادہ ایک دوسرے کے دوست تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آج تک شارب اپنے کسی ہم عمر کو دوست نہیں بنا سکا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ بالکل تنہائی پسند تھا

...... نہیں ...... بلکہ وہ ایک ہنس مکھ اور ملنسار لڑکا تھا۔ بڑا مہذب اور ادب آداب والا۔ مگر دوستی کے معاملے میں اس کی پسند ذرا اونچی تھی۔ وہ ہر معاملہ میں بہترین کا قائل تھا۔

کلاس کا سب سے اچھا طالب علم وہ خود تھا اور اسکول کے بہترین کھلاڑی کا اعزاز بھی اسے حاصل تھا۔ اس لئے پورے اسکول میں اسے کوئی لڑکا اپنی دوستی کے قابل نظر نہیں آتا تھا۔ حالانکہ ریحان بھی اس سے کچھ کم ہوشیار نہیں تھا۔ دونوں کے نمبروں میں بہت معمولی فرق ہوتا تھا۔ مگر ریحان کی شدید خواہش کے باوجود شارب نے کبھی دل سے اسے دوست تسلیم نہیں کیا تھا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ریحان کا رنگ ذرا کالا تھا۔ نہ جانے کیوں شارب کو کالے لوگ اچھے نہیں لگتے تھے۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ ان سے نفرت کرتا تھا بلکہ اس کی تمنا تھی کہ جو چیز بھی اس سے منسوب ہو وہ بہترین ہونی چاہئے۔ یہ خیال اس نے اپنی امی کے رویئے سے اخذ کیا تھا جو ہر معاملے میں اسے دوسروں سے اعلیٰ اور برتر ثابت کرنے کی کوشش کرتی رہتی تھیں۔ اسی لئے وہ چاہتا تھا کہ اُس کا دوست بھی اُسی کی طرح خوب صورت اور لاجواب ہو، جسے وہ اپنے تعلیمی ریکارڈ اور کھیلوں میں ملے ہوئے تمغوں کی طرح دوسرے لوگوں کے سامنے فخریہ انداز میں پیش کر سکے۔ اپنی اس خواہش کا اظہار اکثر وہ اپنے امی ابو کے سامنے بھی کرتا رہتا تھا۔ وہ دونوں اپنے بیٹے کی اس نفاست پسندی اور اعلیٰ ذوق سے بہت خوش ہوتے تھے۔ خاص طور پر امی جان۔

ابو کے چلے جانے کے بعد کچھ عرصہ تو شارب نے بڑے کرب میں گزارا مگر پھر ابو ہی کی نصیحت کے مطابق اس نے کتابوں سے اپنی دوستی مزید گہری کرلی۔ فارغ اوقات میں وہ بچوں کے مختلف رسائل کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ ایک دو پرچے تو اسے بہت پسند آئے تھے۔ خصوصاً ان کے چند مستقل سلسلے ...... جس کے تحت بچوں میں مختلف موضوعات پر مقابلے کرائے جاتے تھے۔ اس طرح جہاں ایک طرف بچوں میں مقابلے کا رجحان اور حوصلہ پیدا ہوتا تھا، وہیں علم میں اضافہ اور مزید علم حاصل کرنے کا شوق بھی ابھرتا تھا۔ اور انعامات الگ ملتے تھے۔ ایک ایسے ہی مقابلہ مضمون نویسی میں شارب نے بھی حصہ لیا تھا۔ "بچے اور ہمارا نصاب تعلیم" ...... شارب نے ایک بہترین مضمون لکھ کر اور استاد صاحب کو باقاعدہ دکھا کر بھیجا تھا مگر جب نتیجہ نکلا تو شارب دوسرے نمبر پر تھا۔ اس نے اول آنے والے مضمون نویس کے نام پر نظر ڈالی تو لکھا تھا، "سلطان نصیر۔ شہداد کوٹ سندھ۔"

یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ شارب کسی میدان میں نمبر دو ہو گیا تھا۔ فطری طور پر سلطان نصیر کے لئے اس کے دل میں حسد کا جذبہ پیدا ہوا مگر یہی جذبہ آہستہ آہستہ رشک اور پھر محبت میں بدل گیا، کیونکہ مختلف رسالوں کے مختلف مقابلوں میں جب بھی شارب نے حصہ لیا تو سلطان نصیر ہی اول آیا

تھا۔ شارب نے خود اس کا مضمون یا کہانی پڑھ کر یہ فیصلہ دیا تھا کہ سلطان ہی اول آنے کا مستحق تھا۔ سلطان کو خود سے بہتر تسلیم کر لینے کے بعد ہی شارب کو اس سے ایک طرح کا لگاؤ ہو گیا تھا۔ اور یوں ان میں قلمی دوستی کا آغاز ہوا۔

سلطان جسے شارب پیار سے سلو کہنے لگا تھا، واقعی ایک حیرت انگیز لڑکا تھا۔ وہ جب کہانی لکھتا تو اس کا موضوع اچھوتا اور اسلوب اتنا شاندار ہوتا کہ پڑھنے والا اس کے سحر سے نکل ہی نہیں سکتا تھا۔ بے شک وہ لفظوں سے تصویر بنانے پر قادر تھا۔ وہ جب چاہتا قاری کو رُلا دیتا اور جب چاہتا بے ساختہ قہقہے لگانے پر مجبور کر دیتا تھا۔

دوستی گہری ہوئی اور خط و کتابت باقاعدہ ہونے لگی تو سلو کے اور بھی اسرار کھلے۔ وہ بہترین گلوکار بھی تھا۔ اس کی آواز میں بلا کا سوز اور لوچ تھا۔ اپنی پڑھی ہوئی نعتوں کی ایک آڈیو کیسٹ اس نے شارب کو بھیجی تھی جسے وہ ہر صبح اپنے کیسٹ پلیئر میں لگا کر سنا کرتا تھا۔ اس سے اسے ایک عجیب سا سرور ملتا...... ایک پر کیف مزہ...... جیسے موسم بہار کی برسات میں ہلکی پھوار میں نہانے سے ملتا ہے۔

پھر سلو صرف ایک کہانی نویس ہی نہیں تھا بلکہ وہ ایک سماجی کارکن بھی تھا۔ وہ اپنے چھوٹے سے قصبے میں طالب علموں کی فلاح و بہبود کے لئے مختلف سرگرمیوں میں مصروف رہتا تھا۔ وہ فٹ بال کا اچھا کھلاڑی تھا۔ شارب ہی کی طرح اسے بھی ڈاک ٹکٹ جمع کرنے کا خبط تھا اور اپنی کلاس کا سب سے اچھا طالب علم تو وہ تھا ہی۔ ان سب خوبیوں کے ہوتے ہوئے سلو ہی شارب کی دوستی کے معیار پر پورا اترتا تھا۔ اور اسی لئے ان کی دوستی گہری اور گہری ہوتی چلی گئی۔

شارب اور سلو کی دوستی کو دو سال بیت چکے تھے۔ اس دوران دونوں نے ایک دوسرے کو ہزاروں خطوط لکھے، سینکڑوں بار فون پر بات ہوئی، مگر آج تک دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا نہیں تھا۔ شارب نے کئی بار سلو سے تصویر بھیجنے کا مطالبہ بھی کیا مگر اپنی تجسس پسند طبیعت کی وجہ سے سلو نے ہمیشہ تصویر دینے سے انکار کر دیا تھا۔ بلکہ اس نے شارب کو بھی منع کر دیا تھا کہ وہ بھی اپنی تصویر نہ بھیجے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر ہم سچے دوست ہیں تو پھر پہلی ملاقات میں ہم ایک دوسرے کو خود ہی پہچان لیں گے۔ شارب نے بھی اس کی بات مان لی تھی۔ اسے اس گمنام دوستی میں بھی بہت مزا آ رہا تھا۔ البتہ اس نے سلو کے بارے میں حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں اس کا ایک خاکہ سا اپنے ذہن میں تشکیل دے لیا تھا۔ اور یہ خاکہ اس کے آئیڈیل سے ملتا جلتا تھا۔ خوب صورت مسکراتا ہوا روشن چہرہ۔ ذہانت سے بھرپور آنکھیں۔ کسرتی بدن، مناسب قامت اور شاندار لباس.......... اپنے اسی آئیڈیل کو سامنے رکھتے ہوئے وہ خوشی خوشی سلو کا استقبال کرنے کے لئے اسٹیشن پر پہنچا تھا مگر اسے دیکھتے ہی اس کی ساری خوشی

کافور ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی شارب کو یوں لگا تھا جیسے وہ یک دم کسی برف زار میں آ گیا ہو۔ چند لمحے پہلے تک دل میں اٹھنے والے ولولے، جوش اور محبت کے طوفان اچانک کہیں غائب ہو گئے تھے۔ اور ان کی جگہ ایک بے نام سی بے کیفی نے لے لی تھی۔ اس کے منہ کا ذائقہ پھیکا سا ہو گیا تھا جیسے بہت عرصہ بیمار رہنے کی وجہ سے ہو جاتا ہے۔

شارب کے ذہن میں فوراً ریحان کا خیال آیا، جس کی دوستی کو اس نے ہمیشہ صرف کالے رنگ کی وجہ سے ٹھکرا دیا تھا۔ مگر اب اس کا سب سے پیارا دوست جو اس کے سامنے کھڑا تھا، ریحان سے بھی زیادہ کالا تھا۔ ریحان کے نقوش تو اچھے تھے۔ مگر سلو تو کسی حد تک بدصورت لڑکا تھا۔

اس نے ایک بار پھر سلو کی طرف دیکھا مگر فوراً ہی نظریں دوسری طرف پھیر لیں۔ ...... تو کیا اس کا دوست سلو یہ بدصورت لڑکا ہے؟ ...... شارب نے سوچا۔ وہ سلو کو دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا مگر اسے چھوڑ کر بھی نہیں جا سکتا تھا۔ دیر تک وہ اسی کشمکش میں مبتلا رہا اور آخر اس فیصلے پر پہنچ کر اسے کچھ اطمینان ہوا کہ وہ فی الحال تو اپنی اخلاقی ذمہ داری پوری کرے گا۔ البتہ بعد میں وہ اس سے کوئی رابطہ نہیں رکھے گا۔ اسے بھول جائے گا اور کوئی بہت ہی اچھا سا دوست تلاش کرے گا۔ اس فیصلے نے اسے حوصلہ دیا اور وہ اپنی اندرونی کیفیات پر قابو پا کر زبردستی مسکراتا ہوا سلو کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچ کر سلو بڑی گرم جوشی ت اس سے بغل گیر ہو گیا۔ رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد دونوں دوست باتیں کرتے ہوئے اسٹیشن سے باہر آ گئے۔ اسٹینڈ سے موٹر سائیکل نکالی اور گھر کی طرف چل پڑے۔

رستے بھر شارب اس کی باتوں پر بس ہوں ہاں کرتا رہا یا کبھی ایک آدھ جملے کا جواب دے دیتا۔ اس کا ذہن تو ابو کی طرف لگا ہوا تھا جو پچھلے ہی ہفتے وطن واپس پہنچے تھے۔ شارب سلو کے بارے میں ابو کو بھی لکھ چکا تھا۔ بلکہ ہر خط میں اس کی تعریف میں کئی کئی صفحات لکھ دیتا تھا۔ لیکن اب سلو کو دیکھ کر ابو اس کی پسند کے بارے میں کیا سوچیں گے؟ یہی نا کہ شارب صاحب کو ڈھنگ کا ایک دوست بھی نہیں مل سکا" ......

ادھر سلو اس کے جذبات سے بے خبر تھا۔ اور اس سے خطوں اور فون پر ہونے والی پرانی باتیں دہرا رہا تھا اور اس کے قہقہے وقفے وقفے سے فضا میں بلند ہو رہے تھے۔ شارب بھی با دل نخواستہ اس کے قہقہوں میں شریک ہو جاتا تھا۔ وہ اچھی خاصی کامیاب اداکاری کر رہا تھا لیکن سچی بات تو یہ تھی کہ اس کا ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ کچھ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ عجیب بے چارگی کا عالم تھا۔

گھر پہنچ کر وہی ہوا جس کا شارب کو ڈر تھا۔ امی ابو نے سلو پر نظر پڑتے ہی حیرت سے شارب کی

طرف، دیکھا تھا۔ جیسے پوچھ رہے ہوں "تو یہ ہیں سلو صاحب!!!" اس نے امی کے چہرے پر تو باقاعدہ نا پسندیدگی بلکہ ناگواری کے تاثرات ابھرتے دیکھے تھے۔ احساس ندامت سے شارب کا سر خود بخود جھکتا چلا گیا۔ شاید وہ دونوں موقع کی نزاکت کو سمجھ گئے تھے، اس لئے اخلاقاً انہوں نے سلو کا استقبال کیا۔ امی جان نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور نوکر سے کہہ کر اس کا سامان کمرے میں پہنچوایا۔

دوپہر کے کھانے کا وقت تھا۔ جتنی دیر میں سلو غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر تازہ دم ہوا، کھانا میز پر لگ چکا تھا۔ شارب اس دوران صرف اپنے کمرے تک محدود رہا۔ اس سارے عرصے میں اس کا ذہن پریشان رہا۔ وہ شاید کھانے کی میز پر بھی نہ جاتا مگر نوکر نے آکر اسے بتایا کہ "بڑے صاحب" بلا رہے ہیں۔ جب وہ وہاں پہنچا تو سلو اور ابو آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ شارب کو دیکھتے ہی ابو نے پیار سے پوچھا۔

"کہاں رہ گئے تھے بھئی...... دیکھو سارا کھانا ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ چلو جلدی سے آجاؤ...... سلطان کو بھی تیز بھوک لگ رہی ہو گی۔" سلو نے اخلاقاً بھوک نہ لگنے کی بات کی تھی مگر شارب کا دماغ اس وقت یہاں حاضر نہیں تھا۔ کھانے کے دوران بھی وہ زیادہ تر خاموش رہا...... ابو نے شکایت کی تو اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا تھا کہ وہ ابو اور سلو کی باتیں سن رہا ہے۔ امی جان اس سارے عرصے میں خاموش بیٹھی کبھی سلو اور کبھی شارب کو دیکھتی رہیں۔ امی جان کے اس انداز سے شارب اور بھی نادم ہوا جا رہا تھا۔

کھانے کے بعد سلو تو آرام کرنے کے لئے چلا گیا مگر شارب ابو کے کمرے میں جا پہنچا۔ امی جان بھی وہاں موجود تھیں۔ شارب ابو سے سلو کے بارے میں کھل کر بات کرنا چاہتا تھا تاکہ اس ذہنی پریشانی سے چھٹکارا مل سکے۔ وہ انہیں سلو کے بارے میں اپنے موجودہ خیالات سے بھی آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر وہ سلام کر کے ابو کے پلنگ پر پائنتی کی طرف بیٹھ گیا۔ ابو نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور ہلکی سی حیرت سے پوچھا۔

"ارے شارب میاں...... تم یہاں...... کیا سلطان سو گیا ہے؟"

"جی ابو۔" اس نے جواب دیا "مجھے نیند نہیں آرہی تھی...... اور پھر آپ سے بھی تو اب تک تفصیلی ملاقات نہیں ہو سکی ہے۔"

"اچھا اچھا...... بہت خوب......" ہاں تو کیا ہو رہا ہے آجکل؟"

"کچھ نہیں ابو بس وہی پرانی مصروفیات ہیں، پڑھنا اور بس پڑھنا۔"

"اچھا۔ ہے بیٹے! علم حاصل کرنے والے ہی دنیا میں کچھ کر سکتے ہیں۔" اس کے ابو نے کہا۔ پھر دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ شارب کوشش کے باوجود سلو کے بارے میں کچھ نہیں کہہ پا رہا تھا۔ آخر اس نے امی کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی ہمت کر کے کہا۔

"ابو...... وہ میں...... سلو کے بارے میں کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔"

"بھئی رہنے دو"...... اس کے ابو نے بات کاٹی "اب اور کیا تعریف کرو گے۔ دس دس صفحے کے خط تو لکھتے رہے ہو...... اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس لڑکے سے مل کر ہمیں بالکل یہ نہیں لگا کہ یہ ہماری ملاقات ہے۔ لگا جیسے ہم مدتوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ خیر یہ بات تو ہے کہ وہ لڑکا واقعی بہت اچھا ہے۔

"جی!!!" شارب نے حیرتوں میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جی۔" ابو نے گردن ہلاتے ہوئے اس کی نقل اتاری۔ "ہم تو سمجھتے تھے کہ آپ ظاہری خوب صورتی کو ہی حسن سمجھتے ہیں...... اور آپ کا دوست کوئی ہیرو ٹائپ کا لڑکا ہوگا۔ لیکن آپ نے ایک ایسے شخص کو دوست بنایا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار خوبیاں دی ہیں۔ ہمیں بہت خوشی ہوئی اس سے مل کر...... واقعی آپ کا انتخاب لاجواب ہے...... آئی پراؤڈ آف یو مائی سن۔" ابو نے اس کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

شارب کے لئے یہ سب کچھ غیر متوقع تھا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ نہ اس کی سمجھ میں یہ بات آرہی تھی کہ وہ ابو کے ان جملوں کے جواب میں کیا کہے۔ اس نے بس "تھینک یو" کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بھاگ لیا۔ وہ سچ مچ حیران تھا۔ اس طرح تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا...... سلو میں وہ تمام خوبیاں تو موجود تھیں جن کا ذکر ابو نے کیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں پہنچا تو سلو بے خبر سو رہا تھا۔ پہلی بار اس نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ سانولا سا معصوم چہرہ...... "یہ بدصورت تو نہیں ہے۔" اس نے سوچا۔ "اچھا خاصہ تو ہے...... میں خواہ مخواہ اس سے بدظن ہو گیا تھا۔" اسے اپنے پچھلے خیالات پر شرمندگی ہوئی۔

"اوہ تھینکس گاڈ۔" اس نے زیر لب کہا اور بے اختیار اپنے بستر پر گر گیا۔ اس کے دل سے ایک بڑا بوجھ ہٹ چکا تھا۔ اس نے ایک نظر سلو کے چہرے پر ڈالی ایک ایسی نظر جس میں خلوص تھا اور اپنائیت تھی۔ پھر اس نے آنکھیں بند کر کے کروٹ بدل لی۔

جنگل کا قانون

ترجمہ: محمد عادل منہاج

یہ دوپہر کا وقت تھا۔ جنگل میں لوگ اس وقت دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ایسے میں ایک گھسیارا گھاس کا ایک گٹھڑ رسی سے باندھے کمر پر لادے چلا جا رہا تھا۔ یہ گھاس اس نے صبح سے دوپہر تک اپنے مالک کی گائیوں کے لئے کاٹی تھی۔ وہ اس وقت جنگل کے ایک گھنے حصے سے گزر رہا تھا کہ اچانک اسے خطرے کا احساس ہوا اور پھر ایک خونخوار قسم کا چیتا جھاڑیوں میں سے نکل کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور اسے گھورنے لگا۔ گھسیارے کے چھکے چھوٹ گئے۔ اس نے سوچا کہ ابھی میں اپنے گھر سے بہت دور ہوں اور یہاں اس چیتے سے بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں لہٰذا اب خود کو حالات کے حوالے کر دینا چاہئے اور سننا چاہئے کہ چیتا کیا کہتا ہے۔ چیتے نے اسے گھورا اور بولا۔ ”او گھاس کاٹنے والے، تو خوفزدہ کیوں ہے اور یہاں سے بھاگنے کی فکر میں کیوں ہے؟“

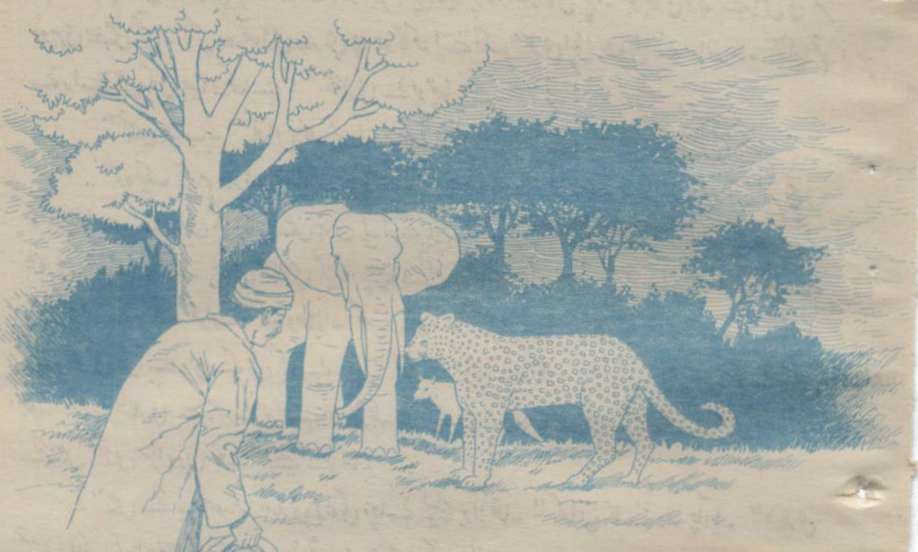

"کیونکہ تم مجھے کھا جاؤ گے۔" وہ کانپتا ہوا بولا۔

"نہیں ایسا نہیں ہے۔" چیتے نے جواب دیا۔ "میری بات سنو، میں ایک انصاف پسند چیتا ہوں۔ اگر تم مجھے اپنے اس گھاس کے گٹھڑ میں چھپا دو تو میں تمہارے ساتھ ایسا ہی سلوک کروں گا جیسا کہ میں اپنے ماں باپ سے کرتا ہوں۔"

گھسیارا سوچنے لگا کہ کیا کرے۔ اس نے سوچا کہ اگر میں نے چیتے کی بات نہ مانی تو یہ مجھے کھا جائے گا۔ آخر سوچ کر وہ بولا۔ "تم بہت بڑے ہو اور بہت وزنی بھی۔ اور میں ٹھہرا ایک کمزور سا آدمی۔ میں تمہارا بوجھ کس طرح اٹھا سکوں گا؟"

"اس صورت میں میں تمہیں ضرور کھا جاؤں گا۔" چیتا غصے سے دھاڑا۔

"نہیں...... نہیں۔" گھاس کاٹنے والا گڑگڑایا۔ "میری ایک بیوی اور چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ میری جان بخش دو۔"

"تو پھر وہی کرو جو میں کہتا ہوں۔" چیتا بولا۔ آخر گھسیارے نے اپنے سر سے گٹھڑ اتار کر کھولا۔ چیتا فوراً گٹھڑ میں گھس گیا اور خود کو گھاس میں چھپا لیا۔ گھاس کاٹنے والے نے اسے چاروں طرف سے گھاس میں چھپا کر رسی سے باندھ دیا اب چیتا گھاس میں سے بالکل بھی نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ اب اس نے بڑی جدوجہد کے بعد گٹھڑ کو اپنی پیٹھ پر لادا اور چل پڑا۔ بوجھ کی وجہ سے اس کی کمر دوہری ہو چلی تھی۔ ابھی وہ تھوڑی دور ہی چلا ہو گا کہ اسے ایک شکاری اپنی بندوق کے ساتھ ملا۔ "کیا تم نے راستے میں کوئی چیتا دیکھا ہے؟" شکاری نے پوچھا۔

"نہیں جناب۔" گھاس کاٹنے والے نے جواب دیا۔ "میں نے کوئی چیتا نہیں دیکھا۔"

"وہ ایک آدم خور اور خطرناک چیتا ہے۔" شکاری بولا "اور بہت سے مرد، عورتوں اور بچوں کو کھا چکا ہے۔ میں اس کی تلاش میں ہوں کہ اسے ہلاک کر دوں۔ تم بھی ذرا بچ کر جانا۔" یہ کہہ کر شکاری آگے بڑھ گیا۔ جونہی شکاری گیا۔ چیتے نے کسمسانا شروع کر دیا۔ "تم نے مجھے بہت سختی سے باندھ رکھا ہے، مجھے کھولو۔" وہ دھاڑا۔ گھسیارے نے گٹھڑ سر سے اتارا اور ایک درخت کے نیچے رکھ دیا۔ جونہی اس نے رسی کے بل کھولے۔ چیتا گٹھڑ سے تیزی سے نکلا۔ "تم ایک لالچی اور جھوٹے شخص ہو۔ تم نے شکاری سے جھوٹ بولا ہے اور چونکہ میں ایک ایماندار چیتا ہوں اور کبھی جھوٹ نہیں بولتا اس لئے میں تمہیں سزا دوں گا۔" چیتے نے کہا۔

"میں نے یہ جھوٹ، تمہاری زندگی بچانے کیلئے بولا تھا۔" گھاس کاٹنے والا چلّایا۔ "شکاری تمہیں ہلاک کرنا چاہتا تھا جبکہ میں نے تمہاری حفاظت کی۔"

چیتے نے اس کے جملوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور بولا۔ "تم ایک موٹے آدمی ہو۔ تمہارا گوشت بھی لذیذ ہوگا میں تمہیں مار کے کھا جاؤں گا۔"

"مگر تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تم مجھ سے ویسا ہی سلوک کرو گے جیسا اپنے ماں اور باپ سے کرتے ہو۔" گھاس کاٹنے والا بولا۔

"مجھے اپنے وعدے کی کوئی پرواہ نہیں۔ یہی جنگل کا قانون ہے۔ یہاں ہر طاقتور کمزور کو کھا جاتا ہے۔ جس کی لاٹھی اسی کی بھینس ہوتی ہے۔ تم بے شک اس درخت سے پوچھ لو۔" چیتا بولا۔

"افسوس، افسوس!" درخت نے آہ بھری۔ "چیتا ٹھیک کہتا ہے اور تم غلطی پر ہو۔ دیکھو میں نے اپنے ارد گرد کتنا سایہ کیا ہوا ہے۔ اس سائے میں مسافر آرام کر سکتے ہیں اور بیٹھ کر کھانا کھا سکتے ہیں۔ مگر وہ مجھ سے یہ فائدہ اٹھانے کے بعد مجھے دیکھ کر کہتے ہیں کہ اگر اس درخت کو کاٹ دیا جائے تو بہت اچھے صندوق اور بستر بنائے جاسکتے ہیں۔ یہاں تو اچھائی کا بدلہ برائی سے ملتا ہے۔ جس کے بس میں جو ہوتا ہے کر گزرتا ہے۔"

"اب تم نے سن لیا کہ درخت نے کیا کہا۔ میں صحیح راستے پر ہوں۔ آخر کو میں ایک ایماندار چیتا ہوں اور جنگل کے قوانین کی پاسداری کرتا ہوں۔" چیتے نے کہا۔ گھاس کاٹنے والے نے بھی ہار نہ مانی اور بولا۔ "بھلا ایک درخت کی بات کا کیا اعتبار۔ اس کا دماغ تو لکڑی کا ہے۔ آؤ ہم اس بھینسے سے پوچھتے ہیں۔" چیتا راضی ہوگیا۔ اور وہ دونوں ایک بھینسے کی طرف بڑھے جو اکیلا ہی گھاس چر رہا تھا۔ وہ ان کی روداد سن کر بولا۔ "یہ جتنے بھی بھینسے تم دیکھ رہے ہو، سب میرے بچے اور پوتے ہیں۔ جب یہ چھوٹے تھے تو میں ان کی حفاظت کرتا تھا۔ مگر اب جبکہ یہ جوان ہوگئے ہیں اور میں بوڑھا اور کمزور تو یہ مجھے سینگ چبھوتے ہیں اور دھکے دیتے ہیں یہاں تک کہ مجھے اپنے قریب گھاس بھی نہیں چرنے دیتے لہٰذا چیتا ٹھیک کہتا ہے۔ یہاں جو طاقتور ہے اسی کا فیصلہ چلے گا۔"

"اب تو تمہیں یقین آگیا کہ میں سچا ہوں لہٰذا اب قریب آجاؤ میں بہت بھوک محسوس کر رہا ہوں۔" چیتا بولا۔ "صبر...... صبر۔" گھسیارا چلّایا۔ وہ اب افسوس کر رہا تھا کہ اس نے جنگل کے قانون پہ عمل کیوں نہ کیا جب چیتا بندھا ہوا تھا تو اسے شکاری کے حوالے کیوں نہ کیا۔

"کیوں نہ ہم ایک تیسرے منصف سے اور فیصلہ کروالیں پھر جو جی میں آئے کرنا۔" اس نے آخری کوشش کی۔ چیتا پھر راضی ہوگیا اسے یقین تھا کہ اب کی بار بھی فیصلہ اسی کے حق میں ہوگا۔ اس بار انہیں ایک لومڑی نظر آئی۔

"بی لومڑی!" دونوں چلّائے۔ "ادھر آؤ اور ہمارے درمیان فیصلہ کرو۔"

لومڑی کے قریب آنے پر چیتے نے ساری رام کہانی سنائی اور بولا۔ "اب تمہارے فیصلے پر میرے دوپہر کے کھانے اور اس کی زندگی کا دارومدار ہے۔" پوری روداد سن کر لومڑی بڑی چالاکی سے بولی۔ "میں اس کہانی پر کیسے یقین کرلوں۔ جب تک کہ میں تمہیں اس گٹھڑ میں چھپا ہوا نہ دیکھ لوں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ تم اس چھوٹے سے گٹھڑ میں چھپ سکتے ہو۔ پہلے تم اس میں چھپ کر دکھاؤ پھر میں منصفانہ فیصلہ کر سکوں گی۔" چیتا جو بھوک سے بے چین تھا اس نے فوراً گھسیارے کو حکم دیا کہ اسے گٹھڑ میں چھپائے۔ گھسیارے نے اسے گٹھڑ میں چھپا دیا اور رسی سے باندھ دیا تو لومڑی بولی، "اب مجھے یقین آگیا کہ تم سچے ہو اور چونکہ یہ جنگل کا قانون ہے کہ طاقتور کمزور پر غالب ہے لہٰذا اس وقت تم رسی سے بندھے ہوئے ہو اور اس شخص سے کمزور ہو لہٰذا میں اسے حکم دیتی ہوں کہ تمہیں سامنے بہنے والے دریا میں پھینک دے۔" یہ سن کر چیتا غصے میں دھاڑنے لگا مگر گھاس کاٹنے والے نے خوشی خوشی اسے اٹھا کر دریا میں پھینک دیا اور یوں ایک ایماندار چیتے کا خاتمہ ہو گیا۔

کوڑے دان کی دردمندانہ اپیل

سب کو اپنا حق عزیز ہوتا ہے۔
کوڑا کرکٹ میرا حق ہے
میرے حق کو گلی میں مت پھینکیے۔
مجھے میرا حق دیجیے۔
ورنہ!
مکھیوں، مچھروں اور صفائی پسند
پڑوسیوں سے روزانہ جنگ کے لیے تیار ہو جائیے

آخری معرکہ

طاہر مسعود

۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کی صبح کا ذکر ہے۔

لال قلعہ دلی میں چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ عظیم مغل سلطنت کے آخری فرمانروا بہادر شاہ ظفر نیند سے بیدار ہو چکے تھے اور دیر سے کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بوڑھے بادشاہ کی طبیعت

ناساز تھی۔ اور وہ کچھ بے چینی سی محسوس کر رہے تھے۔ آج کی صبح بوجھل اور اداس تھی۔ اچانک قلعے کی پشت پر جھروکے کے نیچے سے گھوڑوں کے ہنہنانے اور لوگوں کے چلانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اس سے پہلے کہ بادشاہ سلامت کو کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ملتا کہ خادم خاص نے باریابی کی اجازت چاہی اور کورنش بجالا کر خبر دی کہ میرٹھ میں فوجیوں نے بغاوت کر دی ہے۔ انہوں نے پہلے چنگی کی چوکی کو آگ لگائی اور پھر داروغہ کو جان سے مار ڈالا اور اب دہلی پہنچ کر قلعے کے پیچھے جمنا کی ریتی پر جمع ہیں۔ بادشاہ سلامت کے لئے یہ اطلاع نہایت پریشان کن تھی۔ ایک عرصہ سے کاروبار مملکت سے ان کا تعلق برائے نام رہ گیا تھا۔ کہنے کو وہ بادشاہ تھے۔ بابر، اکبر اور اورنگ زیب کے جانشین تھے لیکن عملاً حکومت کا نظم و نسق ایسٹ انڈیا، کمپنی کے ہاتھوں میں تھا اور بہادر شاہ ظفر تو محض کمپنی کے وظیفہ خوار تھے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی تجارت کے بہانے ہندوستان کی دولت لوٹنے آئی تھی۔ اور پھر آہستہ آہستہ اس نے سارے ہندوستان پر قابض ہونے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس نے نہایت عیاری سے پہلے ملکہ برطانیہ سے ہندوستان میں تجارت کرنے کی اجازت حاصل کی۔ مغل بادشاہ جہانگیر نے کسی بات پہ خوش ہو کر کمپنی کو گجرات میں سورت کے مقام پر گودام اور دفتر بنانے کا پروانہ دے دیا۔ کمپنی کے قدم تجارت کے میدان میں مضبوط ہو گئے تو اس نے مدراس میں سینٹ جارج کا قلعہ بنایا اور بنگال کے نواب کو دھوکا دے کر کلکتہ میں فورٹ ولیم نام کا قلعہ تعمیر کیا اور اس قلعے میں اپنے سامان کی حفاظت کرنے کے بہانے سپاہیوں کو رکھنے کی اجازت بھی حاصل کر لی اور جب یہ سب کچھ ہو گیا تو اس نے اپنے سپاہیوں کی تعداد بڑھانی شروع کی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس نے بنگال کے نواب سراج الدولہ کو سازشوں اور غداروں کی مدد سے شکست دے دی۔ بنگال پر قبضے کے بعد اس نے میسور کے ٹیپو سلطان کو بھی ان ہی ہتھکنڈوں سے ہرا دیا۔ اور یوں ہندوستان کے وسیع رقبے پر اس نے تسلط جمالیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان کی ساری دولت سمیٹ سمیٹ کر انگلستان بھیج رہی تھی جس کے نتیجے میں ہندوستان دن بدن غربت اور افلاس کا شکار ہوتا جارہا تھا۔ یہاں کی دیسی صنعت تباہ و برباد ہو رہی تھی تو دوسری طرف اسی دولت کے بل بوتے پر انگلستان میں فیکٹریاں اور کارخانے لگ رہے تھے۔ یہی نہیں بلکہ کمپنی ہندوستان کے سیاہ و سفید کی مالک بھی بنتی جارہی تھی۔ دہلی کے بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو اس افسوس ناک صورت حال کا شدت سے احساس تھا لیکن وہ مجبور اور بے بس تھے۔ ان میں اتنا عزم، حوصلہ اور صلاحیت نہیں تھی کہ وہ کمپنی کا مقابلہ کر سکتے۔ ہندوستان کی رعایا کے دل میں اب بھی مغل بادشاہ کے لئے احترام اور محبت کے جذبات تھے۔ رعایا خوب اچھی طرح سے جانتی تھی کہ ان کا بادشاہ بے بس ہے۔ گلی کوچوں

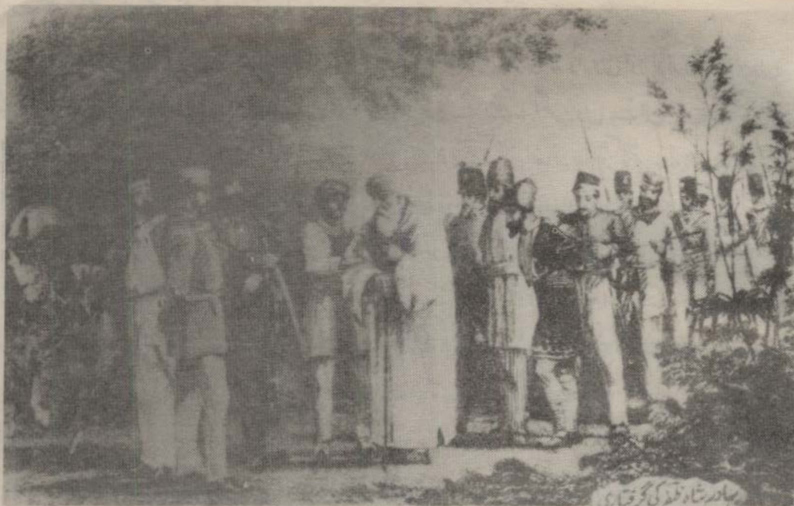

بہادر شاہ ظفر کو ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار کیا جا رہا ہے

میں کہا جانے لگا تھا "خلقت (رعایا) خدا کی، ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا۔" قصہ اتنا سا تھا کہ مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی آنکھیں بند ہوتے ہی ملک چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹ گیا تھا۔ اورنگ زیب کے کسی جانشین میں اتنی اہلیت نہیں تھی کہ وہ سارے ہندوستان کو ایک مرکزی حکومت کے ماتحت کر سکتا۔ چنانچہ اس انتشار سے دوسری باغی قوتوں کے علاوہ کمپنی نے بھی فائدہ اٹھایا۔ کمپنی منظم تھی، نئی تعلیم اور نئے ہتھیاروں سے لیس تھی۔ اس کی پشت پناہی کے لئے انگلستان جیسا طاقتور اور ترقی یافتہ ملک موجود تھا۔ کمپنی جس طرح ہندوستان کی دولت کا چرچا سن کر یہاں آئی تھی اسی طرح دیگر یورپی قومیں مثلاً فرانسیسی اور ڈچ کمپنیاں بھی آئی تھیں لیکن ان میں سے کوئی بھی کمپنی کا مقابلہ نہ کر سکا۔ میدان میں کمپنی تنہا رہ گئی تھی۔ کمپنی کے انگریز کارندے نہایت بدعنوان، فریبی اور گھٹیا ذہنیت کے لوگ تھے جو ہندوستان آتے تھے تو ان کی جیبوں میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہوتی تھی لیکن جب یہاں سے لوٹتے تھے تو ان کے پاس لوٹ کا اتنا مال جمع ہو چکا ہوتا تھا کہ انگلستان میں انہیں طنزاً "نواب" کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ کمپنی کا معاملہ لوٹ مار تک ہی محدود نہ تھا ان کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ہندوستان میں عیسائیت کو فروغ دیا جائے۔ چنانچہ عیسائیت پھیلانے والی مشنریاں کمپنی کے زیر سایہ خوب پھل پھول رہی تھیں اور بھولے بھالے ہندوستانیوں کو مختلف قسم کی لالچ دے کر عیسائی بنانے میں مصروف تھیں۔ اس صورتحال سے ہندوستانی عوام خوش نہیں تھے۔ وہ کمپنی کو اس کی سزا دینا چاہتے تھے لیکن انہیں کوئی ایسی

قیادت میسر نہیں کہ تھی جس کی سرکردگی میں وہ کمپنی کو اس کے کرتوتوں کا مزہ چکھا سکیں۔

بہادر شاہ ظفر کی اپنی حالت یہ ہو گئی تھی کہ وہ اپنے خاندان اور رشتہ داروں اور نوکروں چاکروں کے ساتھ قلعہ کے اندر نہایت تکلیف کے ساتھ گزر بسر کر رہے تھے۔ انگریزوں نے ان کا وظیفہ بھی کم کر دیا تھا۔ اور جب انہوں نے پچھلے معاہدے کے مطابق اپنے وظیفے میں اضافہ چاہا تو کمپنی نے جواب دیا کہ وہ اپنے اختیارات سے دستبردار ہو جائیں تو وظیفے کی رقم بڑھا دی جائے گی۔ بادشاہ نے یہ شرط تسلیم نہیں کی۔ اسی اثنا میں انگریز کمپنی نے سازش سے ایک مغل شہزادے کو ولی عہد بنانا چاہا لیکن شرط یہ رکھی کہ شہزادے کو لال قلعہ خالی کرنا ہو گا اور اسے حکومت ملنے کے بعد خود کو بادشاہ کہلانے کے بجائے صرف شہزادہ کہلانا ہو گا۔ یہ اطلاع جب بہادر شاہ ظفر اور رعایا تک پہنچی تو ان میں شدید غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ اور بالآخر وہ وقت آ گیا جب یہ احساس پیدا ہوا کہ اب ایسٹ انڈیا کمپنی سے ایک آخری معرکہ ہو ہی جانا چاہئے۔

کمپنی کے خلاف جنگ کی زیر زمین تیاریاں ہونے لگیں۔ اودھ کے نواب واجد علی شاہ کی بیگم حضرت محل، وزیر علی نقی خاں، فیض آباد کے ایک زمیندار مولوی احمد شاہ اور دوسری چند شخصیات ایسی تھیں جنہوں نے اس جنگ کے لئے رعایا اور فوج کو آمادہ کرنا شروع کیا۔ مولوی احمد شاہ تو لکھنؤ اور آگرہ میں جابجا جلسے کر کے تقریریں کیا کرتے تھے اور ان جلسوں میں ہزاروں لوگ جمع ہو جاتے تھے۔

ایک اہم مرحلہ یہ تھا کہ کمپنی کی فوج میں جو ہندوستانی سپاہی ہیں انہیں اس جنگ آزادی میں حصہ لینے کے لئے تیار کیا جائے۔ اس کا طریقہ یہ نکالا گیا کہ مجاہدین آزادی نے اپنے لئے نشان چن لئے۔ کنول کا پھول اور ایک چپاتی .... ان کے نشان تھے۔ چنانچہ ان تمام پلٹنوں میں جو کمپنی کے خلاف اٹھ کھڑی ہونا چاہتی تھی، کنول کا پھول گھمایا جاتا تھا۔ پلٹن میں کنول کے پھول کے گھومنے کے معنی یہ تھے کہ پلٹن بغاوت کے لئے تیار ہے۔ اس طرح چپاتی رعایا کے درمیان گردش کرتی تھی۔ گاؤں کا چوکیدار چپاتی دوسرے گاؤں کے چوکیدار کے پاس لے جاتا تھا اس میں تھوڑی خود کھاتا تھا اور باقی گاؤں کے دوسرے لوگوں کو کھلا دیتا تھا۔ اور پھر ایسی ہی چپاتیاں پکوا کر اگلے گاؤں میں پہنچا دیتا تھا۔ چپاتی کھانے والوں میں ایک طرح کا عہد و پیمان ہو جاتا تھا کہ وہ آزادی کی جنگ میں شریک ہوں گے اور کسی صورت میں پیٹھ نہیں دکھائیں گے۔ اس جنگ میں مسلمان اور ہندو سبھی شامل تھے یہاں تک کہ ہندو جو چھوت چھات کے بہت زیادہ قائل تھے۔ انہوں نے چھوت چھات کے مذہبی عقیدے کو بھی اٹھا کر بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ معرکے کی تیاری مکمل ہو چکی تھی اور ۳۱ مئی ۱۸۵۷ء کو سارے ملک میں ایک ساتھ انگریز کمپنی کے خلاف

مجاہدینِ آزادی کو توپ کے دہانے سے باندھ کر اڑایا جا رہا ہے!

جنگ چھیڑ دینے کی تاریخ مقرر کر دی گئی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس نے سارے منصوبے کو الٹ کر رکھ دیا۔ ہوا یوں کہ فوج میں یہ اطلاع پھیل گئی کہ کمپنی نے سپاہیوں کو استعمال کے لئے جو نئے کارتوس دیئے ہیں وہ گائے اور سور کی چربی سے تیار کئے گئے ہیں۔ ان کارتوسوں کو استعمال کرنے کے لئے اس پر چپکی ہوئی جھلی کو دانتوں سے کھینچ کر ہٹانا پڑتا تھا۔ چونکہ گائے کو ہندوؤں کے نزدیک مقدس جانور کا درجہ حاصل تھا اور مسلمان سور کو نجس سمجھتے تھے لہٰذا مسلمان ہندو سپاہیوں میں اس اطلاع سے اشتعال پھیل گیا۔ اور انہوں نے کارتوسوں کو استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔ کمپنی کے افسران نے انکار کرنے والے سپاہیوں کو سزائیں سنانی شروع کر دیں۔ ۶ مئی کو میرٹھ میں کارتوس استعمال کرنے سے منع کرنے والے اسّی سپاہیوں کا کورٹ مارشل ہوا اور انہیں دس دس سال قید کی سزائیں سنائی گئیں۔ شام کو جب ہندوستانی سپاہی شہر میں سیر و تفریح کے لئے گئے تو عورتوں نے انہیں طعنے دیئے کہ "چھی! تمہارے بھائی جیل میں ہیں اور تم یہاں بازار میں مکھیاں مار رہے ہو۔ تمہارے جینے پر لعنت ہے۔"

یہ طعنہ سپاہیوں سے برداشت نہ ہو سکا اور ۱۰ مئی سے ہی بغاوت ہو گئی۔ جیل خانے کی دیواریں توڑ دی گئیں۔ اور انگریزوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ ۱۱ مئی کی صبح کو دو ہزار سپاہی دہلی پہنچے۔ اور لال قلعہ کے پیچھے جمنا کی ریتی پہ جمع ہو گئے۔ بہادر شاہ ظفر کو اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے اپنے معتمد خاص حکیم احسن اللہ خان کو حکم دیا کہ وہ باغیوں سے پوچھ گچھ کریں۔ حکیم احسن اللہ خان نے باغی افسروں سے

بغاوت کی وجہ پوچھی تو وہ گھوڑوں سے اتر کر جھروکے کے نیچے آئے اور ہاتھ جوڑ کر عرض کیا "حضور بادشاہ سلامت ! آپ دین دنیا کے بادشاہ ہیں۔ تمام ہندوستان آپ کا محکوم اور فرمانبردار ہے۔ ہم لوگ آپ کے پاس فریادی آئے ہیں اور انصاف چاہتے ہیں۔ انگریز سرکار ہمارے دین و مذہب کی دشمن ہو گئی ہے اور چاہتی ہے کہ تمام ہندوستان کو عیسائی کر لیں۔ ہم اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔"

بہادر شاہ ظفر نے فوج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"سنو بھائی ! مجھے بادشاہ کون کہتا ہے۔ میں تو فقیر ہوں، ایک تکیہ بنائے ہوئے اولاد کو لئے بیٹھا ہوں۔ یہ بادشاہت تو بادشاہوں کے ہمراہ گئی۔ میں تو ایک گوشہ نشین آدمی ہوں۔ مجھے ستانے کیوں آئے ہو۔ میرے پاس خزانہ نہیں کہ میں تم کو تنخواہ دوں گا۔ میرے پاس فوج نہیں کہ میں تمہاری امداد کروں گا۔ میں کچھ نہیں کر سکتا ہوں۔ مجھ سے کوئی امید نہ رکھو۔"

لیکن بادشاہ کی اس تقریر سے افسروں اور سپاہیوں کا اطمینان نہیں ہوا۔ وہ آزادی کی جنگ کے لئے سر ہتھیلی پہ رکھ کر نکل چکے تھے اور اب واپسی محال تھی۔ دلی میں انگریزوں کا صفایا شروع ہو چکا تھا۔ بہادر شاہ ظفر نے دیکھا کہ صورت حال قابو سے باہر ہو چکی ہے اور ان کے سامنے دو ہی راستے باقی رہ گئے ہیں۔ باغیوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیں یا پھر ان کی قیادت قبول کر لیں۔ پہلی صورت میں وہ باغیوں کو ان کے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتے تھے اور دوسری صورت میں بہر حال یہ امید تھی کہ باغی کامیاب ہو جاتے ہیں تو ان کی بادشاہت اپنے تمام اختیارات کے ساتھ بحال ہو جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے شہر کے معززین کی کونسل طلب کی اور ان سے مشورہ کیا اور یہ فیصلہ ہوا کہ جنگ میں حصہ لیا جائے۔ شہزاد مرزا مغل کو فوج کا کمانڈر انچیف مقرر کیا گیا اور دوسرے شہزادوں کو بھی بڑے بڑے عہدے دیئے گئے۔ اس جنگ آزادی میں ایک اہم نام بخت خاں کا بھی ہے جس نے شجاعت و بہادری کے شاندار کارنامے انجام دیئے اور اسے گورنر جنرل کے خطاب سے نوازا گیا۔

جنگ آزادی چار مہینے تک جاری رہی۔ ابتدا میں مجاہدین کا پلہ بھاری رہا لیکن پھر انگریز فوجیں جیتنے لگیں اور اس کی کئی وجوہ تھیں۔ مجاہدین کی جو لوگ قیادت کر رہے تھے، ان میں آپس میں اتفاق نہیں تھا۔ یہ جنگ کسی منصوبہ بندی کے تحت نہیں لڑی جا رہی تھی اور پھر خود بادشاہ کے کئی با اعتماد ساتھیوں مثلاً حکیم احسن اللہ خان، مرزا الٰہی بخش وغیرہ نے غداری کی اور در پردہ انگریزوں سے ساز باز کر لی۔ بہادر شاہ ظفر ایک سیدھے سادے اور بامروت آدمی تھے۔ انہوں نے غلط لوگوں پر اعتماد کیا اور

غلط فیصلے کئے اور پھر انگریز زیادہ منظم تھے اور ان کے پاس جدید ہتھیار تھے۔ اس طرح یہ جیتی ہوئی جنگ شکست سے دو چار ہوئی۔ بہادر شاہ گرفتار کر لئے گئے۔ مغل شہزادوں کو قتل کر دیا گیا۔ انگریزوں نے دلی پر قبضہ کرنے کے بعد ظلم و ستم کے وہ پہاڑ توڑے کہ خود انگریز مورخین بھی اس کی مذمت کئے بغیر نہ رہ سکے۔ مورخ بتاتے ہیں کہ گاؤں کے باہر توپیں لگا دی جاتی تھیں اور سب مردوں، عورتوں، بچوں اور جانوروں سمیت گاؤں کو آگ لگا دی جاتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ بعد میں انگریزوں نے بغاوت کے الزام میں سینکڑوں مجاہدین پر مقدمات چلائے اور انہیں سزائے موت دے دی۔ خود بہادر شاہ ظفر پر بغاوت کا مقدمہ چلا اور انہیں رنگون میں قید کی سزا ملی جہاں ان کا نہایت کسمپرسی میں انتقال ہوا۔ یوں تو اس جنگ آزادی میں شکست ہوئی لیکن مجاہدین نے جس بہادری سے آزادی کے لئے جدوجہد کی، اس کے تذکرے تاریخ کے صفحات پر آج بھی روشن ہیں۔

جن کتابوں سے مدد لی گئی۔

۱...... بہادر شاہ ظفر، اسلم پرویز

۲...... آزادی کی کہانی، غلام حیدر

۳...... جنگ آزادی کی تلخ یادداشتیں، ایڈورڈ تھامسن۔

جب بھی
بال کٹائیں
یہ حلیہ
بنوائیں

آنکھ مچولی البم

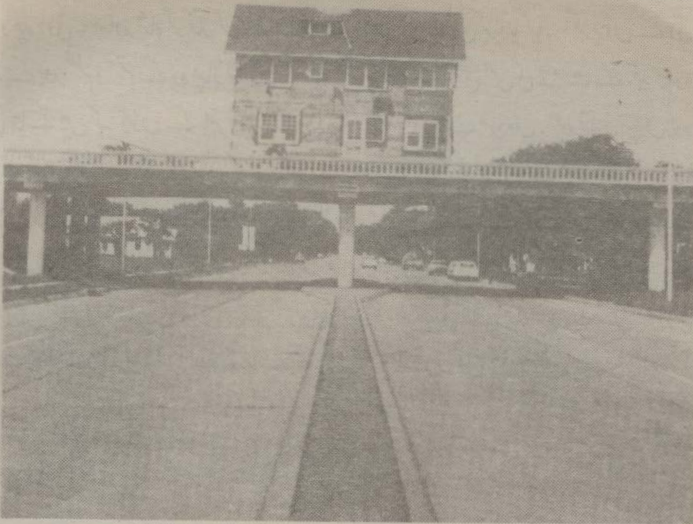

مکان ٹرالر پر ، ٹرالر پُل پر

زیبرا کراسنگ پر دو ڈبے ، ڈبوں تلے دو بندے

"السلام علیکم" ایک انمول نسخہ

ڈاکٹر سید پیر غلام نبی شاہ جیلانی

آپ ایک دوسرے سے ملتے وقت دن میں کئی بار "السلام علیکم" کہتے ہیں۔ کیا کبھی ایک بار بھی آپ نے غور کیا کہ اس کے کونسے اور کتنے فائدے ہیں؟ اگر نہیں تو آیئے ہم آپ کو بتاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا انمول نسخہ ہے جس کو خلوص و فہم کے ساتھ اگر مسلسل استعمال کیا جائے تو درج ذیل فائدے حاصل ہوتے ہیں۔

(۱) رابطہ

اس سے روابط بڑھتے ہیں۔ جب آپ کسی سے بات کرنے سے پہلے "السلام علیکم" کہتے ہیں تو اس سے آپ کے رابطہ کی ابتدا ہو جاتی ہے اور یوں آپ اپنی بات کا آغاز کرتے ہیں۔

(۲) دعا

جب آپ کسی سے "السلام علیکم" کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ "آپ پر سلامتی ہو" یعنی آپ اسے ایک طرح سے دعا دیتے ہیں جس سے آپ کی اس شخص کے متعلق نیک خواہش کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ شخص بھی آپ کو جواباً "وعلیکم السلام و رحمتہ اللہ و برکاتہ" کہہ کر دعا دیتا ہے۔

(۳) شناخت

اس سے آپ کی شناخت ہوتی ہے کہ آپ مسلمان ہیں کیونکہ یہ مسلمانوں کا ہی سلام ہے۔

(۴) تجدید عہد

"السلام علیکم" کہہ کر آپ اس عہد کو دہرا رہے ہوتے ہیں کہ میں ایک ایسے مذہب سے تعلق رکھتا ہوں جس کی ایک بنیادی شرط یہ بھی ہے کہ، "مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔" جس سے آپ کی امن پسندی ظاہر ہوتی ہے۔

(۵) غصّہ میں کمی

اگر آپ کسی سے ناراض ہیں اور وہ آکر آپ کو "السلام علیکم" کہتا ہے تو اس طرح اس شخص سے متعلق آپ کے غصہ میں کسی حد تک کمی ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح اگر آپ سے کوئی شخص خفا ہے اور آپ اسے "السلام علیکم" کہتے ہیں تو یقیناً اس کے غصہ میں کسی حد تک کمی واقع ہوگی۔

(٦) باہمی تعلقات میں اضافہ

اگر آپ کسی اجنبی کو بھی روزانہ "السلام علیکم" کہیں تو ایک دن وہ آپ کا دوست بن جائے گا۔

کیسا! ہے نا انمول نسخہ!

اِن پر اعتماد کیجیے

اِن سے تعاون کیجیے

محمد حسین برادرز ــــــ کراچی ۷۷۲۴۱۲۶
سلطان نیوز ایجنسی ــــ لاھور ــ ۵۸۲۴۹
ملک تاج محمد ــــــ راولپنڈی ــ ۵۵۴۳۲
مہران نیوز ایجنسی ــــ حیدرآباد ــ ۲۰۱۲۸
افضل نیوز ایجنسی ــــ پشاور ــ ۶۲۵۱۵
اے ایس حامد نیوز سروس ــ ملتان ــ ۴۳۳۱۰
فیاض بک ڈپو ــــ فیصل آباد ــ ۲۷۴۰۶
ایم ایم ٹریڈرز ــــــ کوئٹہ ــ ۷۵۰۰۲
اسلم نیوز ایجنسی ــــ گوجرانوالہ ــــ
سلمان برادرز ــــــ نوابشاہ ــ ۲۴۱۴
سعید بک سٹال ــــ گجرات ــ ۳۶۳۹
پاکستان اسٹینڈرڈز بکسٹال ــ سرگودھا ــ ۶۲۹۵۱
طاہر نیوز ایجنسی ــــ جہلم ــــ
کیپٹل نیوز ایجنسی ــــ بہاولپور ــ ۲۹۵۷
چوہدری امانت علی اینڈ سنز ــ رحیم یار خان ــ ۲۶۲۶
مسلم بک ڈپو ــــــ سرائے عالمگیر ــــ
رحمت بکسٹال ــــ اوکاڑہ ــــ
رہبر نیوز ایجنسی ــــ منڈی مدرسہ ــــ
ملک اینڈ سنز ــــــ سیالکوٹ ــ ۸۷۹۸۹
سلطانی نیوز ایجنسی ــــ چکوال ــــ

وطنِ عزیز کے قریے قریے
اور نگر نگر
ہر ماہ باقاعدگی سے
آنکھ مچولی
پہنچانے کے لیے ہم نے

اِن اداروں کو
اپنا باقاعدہ ایجنٹ
مقرر کیا ھے

آنکھ مچولی خریدنے کے لیے
اپنی تجاویز اور مشوروں کے لیے

ان ناموں پر اعتماد کیجیے

خط و کتابت کے لیے

ماہنامہ **آنکھ مچولی** - ڈی ۱۱۲ سائٹ • کراچی ۱۶

تیراک

علی اکمل تصور

ایک ایسے تیراک کی کہانی جو خشکی پر ڈوب گیا تھا

موٹے رسے پر میری گرفت مضبوط ہوتی جارہی تھی۔ میں رسے کو برابر اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ اور اس عمل میں مجھے کافی مشکل پیش آرہی تھی۔ لیکن میں نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ ہاتھ آئے اس شکار کو کسی صورت ضائع نہیں ہونے دوں گے۔ تب میں نے رسے کے سرے پر بندھے جال کو دیکھا۔ میری کشتی اب ڈولنے لگی تھی۔ لیکن مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ میری نظریں تو صرف جال میں موجود مچھلیوں کو دیکھ رہی تھی جو پھُدک پھُدک کر جال سے باہر نکل جانا چاہتی تھیں مگر کامیاب نہیں ہو پا رہی تھیں۔ جال پانی سے باہر آگیا تو میں بے اختیار ہو کر چلانے لگا،

"ارے زلیخا! دیکھ تو میں نے کتنی ڈھیر ساری مچھلیاں پکڑیں۔ دیکھ تو...... اب ہمیں ایک ہفتے تک کوئی فکر نہیں...... کوئی فکر نہیں۔" میں چلا رہا تھا اور میری کشتی مچھلیوں کے بوجھ کی وجہ سے ڈول رہی تھی۔ میری خوشیوں پر اوس پڑتی جارہی تھی۔ پھر میں اپنے ہی ہاتھوں سے مچھلیاں اٹھا اٹھا کر دریا میں پھینکنے

لگا۔ میرے ہاتھ بہت تیزی سے چل رہے تھے۔ اسی وقت میرے کانوں سے کسی کے رونے کی آواز ٹکرائی۔ اور میں ہڑبڑا کر سیدھا ہو گیا۔ میں اپنے کچے مکان میں تھا۔ وہ مچھلیاں، وہ کشتی، وہ دریا، معلوم نہیں کہاں چلے گئے تھے۔ میں نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ میرا بیٹا جگو منہ کھولے رو رہا تھا۔ میں نے اپنی حالت پر غور کیا تو ساری بات سمجھ میں آ گئی۔ میں خواب دیکھ رہا تھا۔ اور خواب میں مچھلیاں واپس دریا میں پھینکتے ہوئے میں نے اپنے بیٹے کو ہی پیٹ ڈالا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ رونے لگا تھا۔ میں نے گھبرا کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ دن بھر کے کام سے تھکی ہاری بے سُدھ سو رہی تھی۔ میں نے جلدی سے جگو کو دلاسا دیا۔ اور جب وہ سو گیا تو میں نے بھی کروٹ بدل لی۔ اچانک مجھے شدید سردی کا احساس ہونے لگا۔

میں نے اپنے اوپر پڑے لحاف کو اچھی طرح اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیا۔ لیکن اب لحاف کے پھٹے ہوئے حصوں میں سے ٹھنڈک کا احساس میرے وجود میں کسی تیر کی طرح چبھنے لگا۔ میں بے چین ہو کر اٹھ بیٹھا۔ گردن موڑ کر میں نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔ وہ بھی سردی کی شدت سے ٹھٹھر رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنے لحاف کو تہہ کیا اور اس پر ڈال دیا۔ اب مجھے ایک عجیب سا سکون مل رہا تھا۔ میں کھڑا ہو گیا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔

میں نے دس سال پہلے میٹرک بہت اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا۔ جب میں اپنی اس کامیابی پر خوش ہوتا ہوا گھر پہنچا تو میری بہن نے مجھے بتایا کہ بابا دریا پر مچھلیاں پکڑ رہا ہے۔ میں بھاگا بھاگا دریا پر پہنچا۔ دریا کے کنارے کنارے پانی کم تھا۔ اور میرا بابا کنارے سے دس فٹ دور کھڑا مچھلیاں پکڑ رہا تھا۔ میں نے وہیں سے چلّا کر کہا تھا۔ ”بابا...... دیکھ تیرا بیٹا دسویں میں پاس ہو گیا ہے۔ اب میں نوکری کروں گا۔ بہن کی شادی کروں گا۔ اب تجھے مچھلیاں پکڑنے کے لئے گھنٹوں دریا میں رہنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔“

میں چِلّا رہا تھا۔ اور میرا باپ کانپتا ہوا کنارے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں اسے سہارا دینے کے لئے آگے نہیں بڑھا۔ مجھے اس دریا سے نفرت تھی۔ مجھے مچھلیاں پکڑنے سے نفرت تھی۔ پھر میرا باپ خود ہی میرے پاس پہنچ گیا۔ اور میں اس کے سینے سے لگ گیا۔

میں ملازمت کی تلاش میں مارا مارا پھرا لیکن مجھے کامیابی نا ہوئی اور دو مہینے یونہی گزر گئے پھر ایک جگہ مجھے نوکری کی امید نظر آئی۔ وہاں انٹرویو دینے گیا۔ لیکن وہاں ایک ایسے امیدوار کو رکھ لیا گیا جس کے پاس کسی وزیر کی سفارش تھی۔ انٹرویو دے کر جب گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ بابا حسبِ معمول دریا پر مچھلیاں پکڑ رہا ہے۔ دریا پر پہنچا تو بابا نے دور سے ہی پوچھا۔

"کیوں پتر! نوکری ملی یا نہیں ؟" اور میں نے بے بسی سے کہا تھا،
"بابا...... وہ سفارشی چٹھی مانگتے ہیں۔" بابا نے کہا،

"آ پتر، میں تجھ مچھلیاں پکڑنا سکھا دوں۔" اور تب میں دریا میں اتر گیا تھا۔ اب مجھ اس دریا سے غیریت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اب یہ دریا مجھ اپنا اپنا سا لگتا تھا۔ پھر تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد میرا بابا مر گیا۔ اس دن میں بہت رویا۔ مگر آہستہ آہستہ یہ زخم بھی بھر گیا۔ اور میری زندگی مچھلیوں، جال اور کشتی کے درمیان گزرنے لگی۔ آج اس بات کو دس سال گزر چکے تھے۔

میں ماضی کے بھنور سے نکل کر حال میں آگیا۔ اب صبح ہونے والی تھی۔ میں نے اپنی بیوی اور بچے کی طرف دیکھا۔ اور پھر جال اٹھا کر باہر نکل آیا۔ دریا کی آواز میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد میں اپنی کشتی تک پہنچ گیا۔ اور دریا میں اتر گیا میں نے جال پھینکا اور سوچنے لگا کہ دیکھئے اب قسمت کب مہربان ہوتی ہے۔

سورج کافی بلند ہو چکا تھا۔ رات کے خواب کا اثر گو ذہن پر تھا مگر ذرا دھندلا گیا تھا، اور میری توجہ مچھلیوں کو پکڑنے کی طرف تھی۔ دن کے گیارہ بجے ہوں گے جب مجھے ایک جیپ نظر آئی۔ اس میں ایک جوان آدمی اور ایک لڑکا بیٹھے ہوئے تھے۔ لڑکے کے ساتھ والی سیٹ پر ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ جو غالباً لڑکے کی ماں تھی۔ جیپ دریا کے کنارے آ کر رک گئی۔ لڑکا پھلانگ کر نیچے اترا اور دریا کے پانی کو ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگا۔ اس کی ماں ادر باپ نیچے اترے اور جیپ میں سے ایک تہہ کی ہوئی چٹائی نکال کر زمین پر بچھانے لگے۔ پھر وہ کھانے پینے کی اشیاء اس چٹائی پر رکھنے لگے۔ لڑکا بھی اس کام میں ان کی مدد کر رہا تھا۔

یہ لوگ پکنک منانے کے لئے یہاں آئے تھے۔ ویسے بھی یہاں لوگ آتے رہتے تھے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ میں نے رخ بدلا اور دریا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میرا جال ابھی تک بے وزن تھا۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ چنانچہ میں جال کو واپس کھینچنے لگا۔ اسی وقت جال تن گیا۔ اور مجھ پر جوش کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ جال اب بہت وزنی ہو گیا تھا۔ میں اسے مسلسل کھینچ رہا تھا۔ پھر مجھے جال میں مچھلیاں اچھلتی کودتی نظر آنے لگی۔ رات والا خواب اب سچا ثابت ہو رہا تھا۔ اسی وقت میرے کانوں سے کسی کے چیخنے کی آواز ٹکرائی۔ جال کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک دل ہلا دینے والا منظر میرے سامنے تھا۔ جیپ سے اترنے والا وہ آدمی اور عورت دریا کے کنارے کھڑے چیخ رہے تھے۔ اور وہ لڑکا دریا میں ڈوب رہا تھا۔ کبھی وہ لڑکا پانی کے نیچے چھپ جاتا تھا، کبھی پانی کا دباؤ اسے اوپر اچھال دیتا تھا۔ لڑکا کسی بھی لمحے ڈوب سکتا تھا۔ میری ذرا سی کوشش اسے بچا سکتی تھی۔ لیکن میرے

ہاتھوں میں جال تھا۔ اور جال میں مچھلیاں تھی۔ میں نے جال سے نظریں ہٹا کر کنارے کی طرف دیکھا۔ اب وہ عورت بے تحاشہ رو رہی تھی۔ وہ آدمی حسرت سے لڑکے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور وہ لڑکا...... وہ ابھی تک پانی سے جنگ کرنے میں مصروف تھا۔ میں نے جلدی سے جال کو اپنی طرف کھینچا۔ لیکن جال وزنی تھا۔ وہ ہلا تک نہیں۔ پھر میرے دل نے کہا کہ جال کو چھوڑ دوں اور دریا میں چھلانگ لگا کر بچے کو بچالوں۔ لیکن ...... لیکن میں جال کو کیسے چھوڑ دیتا۔ کیسے چھوڑ سکتا تھا۔

میں نے پھر پلٹ کر لڑکے کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر پہلے جہاں لڑکا اپنی زندگی بچانے کے لئے جدوجہد کر رہا تھا وہاں اب پانی پر سکون ہو چکا تھا۔ وہ ...... وہ لڑکا ڈُوب چکا تھا۔ اور اس کے ماں باپ کنارے پر آنسو بہا رہے تھے۔ میں نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ مچھلیوں سے بھرا جال جانے کب کا میرے ہاتھوں سے پھسل کر دریا برد ہو چکا تھا۔ اور میں...... میں ایک تیراک، خشکی پر کھڑے کھڑے ڈُوب گیا تھا۔

اسٹوری ٹائم

ریڈیو سے ہر شام 7:50 پر

احمد فوڈ انڈسٹریز کے تعاون سے

ملک بھر کے ریڈیو اسٹیشن بچوں کے لئے پیش کرتے ہیں

کہانیوں کا ایک دلچسپ اور مزے دار سلسلہ

ہر شام کہانی ۔ ہر شام سہانی

چیزوں کی کہانی

پلنگ

آصف فرخی

پلنگ ہمارا رات دن کا ساتھی ہے۔ یہ نہ ہو تو رات کی نیند اور دن کا آرام دوبھر ہو جائے۔ نرم گدیلا بستر نیند کے وقت ہمیں سلاتا ہے، اور دن کے وقت سستانے کا موقع دیتا ہے۔ ہم اس پر لیٹ جاتے ہیں تو یہ ہمیں نیند کی وادیوں کی سیر کراتا ہے۔ اس سیر سے ہم تازہ دم ہو کر اٹھتے ہیں تاکہ پھر دن بھر اپنے کام کاج میں مصروف رہیں۔ تھک جائیں یا بیمار پڑ جائیں تو پھر اس کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس کی بدولت ہمیں نیند کا سکون میسر آتا ہے، اور یہی ہمارے خوابوں کا شریک بن جاتا ہے۔ بچپن کے جھولنے اور پنگوڑے سے لے کر آخرِ زندگی کے بسترِ مرگ تک، یہ زندگی کے ناٹک کا اسٹیج بھی ہے۔ ہمیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہماری زندگی کا کتنا بڑا حصہ پلنگ پر گزر جاتا ہے۔

پلنگ اور بستر کی جو سہولت آج ہمیں میسر ہے؟ وہ بہت پرانے زمانے کے لوگوں کو حاصل نہیں تھی۔ ابتدائی زمانے کے لوگ کہیں ٹک کر نہیں بیٹھتے تھے، آج یہاں، کل وہاں۔ ان کا کوئی مستقل ٹھکانا نہیں تھا۔ دن شکار کی تلاش میں گزرتا۔ رات ہو جاتی تو کسی چٹان کے ساتھ، یا درخت کے نیچے پناہ میں گزرتا۔ رات ہو جاتی تو کسی چٹان کے ساتھ، یا درخت کے نیچے پناہ ڈھونڈھتے۔ وہ گھاس پھونس یا پتوں کے ڈھیر کو اپنا بستر بناتے، یا نرم پودوں پر لیٹتے۔ خالی زمین پر لیٹنا مشکل تھا۔

جب شکار کرنے والے، کھیتی باڑی کرنے لگے تو بستر نے بھی ایک باقاعدہ شکل اختیار کرنا شروع کی۔ فرش کے اوپر گھاس یا بھوسے کو بچھا لیا جاتا اور لوگ ان پر سو جاتے۔ جانوروں کی کھال، یا تھیلے میں بھوسے بھر دینے سے پہلا گدا بنا۔

بارش کے دنوں میں یا سیلابی علاقوں میں لوگ احتیاط کی وجہ سے اپنا بستر، پتھر کی ابھری ہوئی سلوں پر یا لکڑی کے مچان پر، بچھاتے۔ جلد ہی یہ ہوا کہ لکڑی کے اس مچان کی جگہ ایک ڈھانچے نے لے لی، جس میں پائے لگا دیئے گئے تاکہ اسے ہلانا اور اٹھانا آسان ہو۔ یہ ڈھانچہ پہلا پلنگ بن گیا۔

یوروپ کے قبائلی باشندے اپنے لئے معمولی

صندوق سے بنوالیتے، جن میں گھاس اور پتے بھر لیتے، اور رات کوانہی میں سوجاتے۔ اس سے بہت پہلے قدیم مصر میں پلنگ کارواج پڑچکا تھا۔ مصر کے لوگ سر کے نیچے رکھنے کے لئے، لکڑی کے ٹکڑے استعمال کرتے تھے۔

قدیم یونان میں لیٹنے کے لئے کوچ یا پلنگڑی بہت مقبول تھی۔ یونانیوں کے بر خلاف قدیم روم میں پلنگ اور مسہریوں کا دستور تھا۔ یہ پلنگ تانبے کے بنے ہوئے تھے اور ان پر خوب نقش و نگار ہوتے۔ غریب غرباء کے لئے پھر بھی بھوسے یا پیال پر لوٹ لگانا عام تھا۔

پلنگ اس زمانے میں بہت مہنگے تھے، کیوں کہ بڑی مہارت سے بنائے جاتے تھے۔ اس لئے ایک زمانے تک یہ قیمتی اثاثہ سمجھے جاتے تھے۔

ازمنۂ وسطیٰ کے قلعے اور محلات، روشنی اور گرمی کا مناسب انتظام نہ ہونے کی وجہ سے نم اور ٹھنڈے رہا کرتے تھے۔ جاڑے کی کسی رات کمرے کی نمی سے بچنے کے لئے کسی امیر نے اپنے پلنگ کے چاروں طرف پردے لگوالئے۔ ان کو اتنا پسند کیا گیا کہ پھر بستر کے چاروں طرف تنی ہوئی چادر عام ہوگئی۔ جلد یہ بستر کے اوپر شامیانے کی طرح کی چھت بھی پڑنے لگی اور پلنگ چھوٹا موٹا خیمہ بن گیا۔

سردی کے زمانے میں تو یہ پلنگ ایسی آرام کی جگہ بن جاتا کہ اسے چھوڑنے کا جی نہ چاہتا۔ لوگ پورا پورا دن اس میں گزار دیتے، بلکہ بعض بادشاہ یہیں لیٹے لیٹے دربار بھی منعقد کر لیتے۔

پلنگ زمین سے اونچے بنائے جارہے تھے اور رفتہ رفتہ اتنے اونچے ہوگئے کہ سترھویں صدی میں پلنگ پر چڑھنے کے لئے چھوٹی سی سیڑھی استعمال ہوتی۔ نیچے جو خالی جگہ بچتی، اس میں بچوں کو لٹایا جاتا۔

پہلے پہلے بھیڑوں کی کھال اور سمور سے گرمائی حاصل کی جاتی، کیوں کہ لحاف عام نہیں ہوئے تھے۔ پھر بطخ کے پروں سے بھری ہوئی چادر سے رضائی کا کام لیا جانے لگا۔ ہر شہر میں بطخیں، مرغابیاں اور قاز پالے جاتے کہ ان سے پَر حاصل کئے جاسکیں۔

لحاف اور پلنگ نے بہت سی شکلیں اختیار کی ہیں ۔ اب بھی دنیا کے مختلف ملکوں میں الگ الگ دستور ہیں۔ افریقہ کے دیہات میں سونے کے لئے چٹائی استعمال ہوتی ہے۔ لاطینی امریکا کے انڈین باشندے جھولن کھٹولا استعمال کرتے ہیں، جس میں ایک چادر، دو درختوں یا دو کھمبوں کے درمیان تان دی جاتی ہے، بستر کا بستر اور جھولے کا جھولا۔

ہمارے ملک میں پرانے زمانے میں پلنگ، چھپر کھٹ اور مسہریاں استعمال ہوتی تھیں۔ بادشاہوں کے پلنگ اعلا درجے کے مرصّع ہوتے اور ان پر جواہرات جڑے ہوتے۔ پلنگ کے پائے یاتو خالص سونے چاندی کے ہوتے یا لکڑی کے پائے پر سونے چاندی کا خول چڑھا دیا جاتا۔ یہ پلنگ نواڑ سے بنے

جاتے۔ اس نواڑ کے بارے میں کتابوں میں لکھا ہے کہ یہ ریشم کی طرح ملائم، نرم اور چمک دار ہوتی۔

جس پلنگ کے اوپر چھتری اور پوشش ہوتی، وہ چھپر کھٹ کہلاتا۔ رنگین کپڑوں سے سجے ہوئے چھپر کھٹ، شادی بیاہ کے موقعے کے لئے تیار کئے جاتے۔

اونچے پائے والی اور چوڑی چوڑی مسہری، پلنگ سے بڑی ہوتی۔ اس کا رواج امیروں میں زیادہ ہوتا۔ عوام میں چار پائی مقبول تھی۔ ہلکی پھلکی، آسانی سے اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائی جانے والی اور سستی۔ یہ بان یا رسی سے بُنی ہوئی ہوتی۔ زیادہ گرمی ہوتی تو بان پر پانی چھڑک کر انہیں ٹھنڈا کرلیا جاتا۔ پرانے بادشاہوں کے زمانے سے لے کر آج تک، چار پائی مقبول چلی آرہی ہے۔ ہمارے ملک میں اس کا رواج عام ہے۔ لوگوں کی اکثریت اب بھی چار پائی پر سوتی ہے۔

The First name
in Bicycles, brings
ANOTHER FIRST

SOHRAB
VIP
sports

Sohrab the leading national bicycle makers now introduce the last word in style, in elegance, in comfort, absolutely the last word in bicycles.

PAKISTAN CYCLE INDUSTRIAL COOPERATIVE SOCIETY LIMITED
National House, 47 Shahrah-e-Quaid-e-Azam Lahore Pakistan.

Midas

کرشمہ

اظہر نیاز

قسط نمبر ۴

جواد ذیشان کا دوست تھا۔ وہ ایک حیرت انگیز صلاحیت کا مالک تھا جسے ذیشان کے ابو، آغا عمران نے چھٹی حس کا نام دیا تھا۔ جواد کو آنے والے خطرات کا پہلے سے علم ہو جاتا تھا اور اس حس کا مظاہرہ وہ اکثر کرتا رہتا تھا ایک بار اس نے اسکول میں اچانک یہ شور مچا کر کہ چھت گرنے والی ہے، پوری کلاس کو کمرے سے باہر نکال دیا اور واقعی تھوڑی دیر بعد چھت گر گئی۔ آغا عمران پولیس افسر تھے۔ جواد نے کئی کیسوں میں ان کی بھرپور مدد کی تھی۔ آج بھی وہ ذیشان سے ملنے آیا تو آغا عمران سے اس کی ملاقات ہو گئی جنھوں نے جواد کو خوش خبری سنائی کہ وہ حسب خواہش ٹی وی کے ڈراموں میں کام کر سکتا ہے۔ انھوں نے اسے اپنے ایک دوست ٹی وی پروڈیوسر کے نام تعارفی خط بھی دیا۔ مگر جواد نے انھیں جو بات بتائی اسے سن کر وہ ڈر سے گئے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ آپ کی جان کو خطرہ ہے۔

آغا عمران دفتر پہنچے تو پہلا ٹیلی فون آئی جی صاحب کا تھا۔ انھوں نے ایک بہت اہم کیس ان کے حوالے کیا تھا اور اس کے بارے میں ضروری ہدایات اور ہر ممکن قانونی اختیارات بھی دیئے تھے۔ انسپکٹر شعیب کو ان کا مددگار بنایا گیا تھا جو ایک طرح سے آغا صاحب کے دست راست تھے۔ .... جواد، آغا عمران کا خط لے کر اپنی امی کے ساتھ ٹیلی ویژن اسٹیشن پہنچا تو اس کی ملاقات پروڈیوسر انصاری صاحب سے ہوئی۔ آڈیشن میں جواد کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی اور انصاری صاحب نے اسے پیدائشی اداکار کا خطاب دیتے ہوئے ڈرامے کے لئے منتخب کر لیا جس میں اسے ایک چلڈرن کلب کے چیئرمین کا کردار کرنا تھا۔ انصاری صاحب سے رخصت ہونے سے قبل جواد نے ٹی وی اسٹیشن کو بجلی کی فراہمی کے ذرائع کے

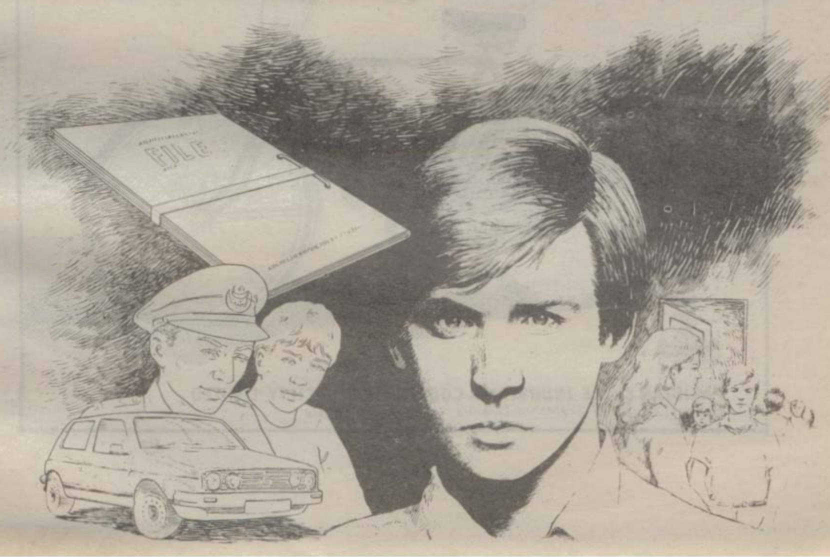

بارے میں ایک غیر متوقع سوال کیا تو انصاری صاحب نے اسے بتایا کہ بجلی چلی جانے کی صورت میں جنریٹر استعمال ہوتا ہے۔ اور اگر وہ بھی خراب ہو تو ظاہر ہے اسٹیشن کا سارا کام رک جائے گا۔ جب جواد ان کے کمرے سے نکلا تو اچانک لائٹ آف ہوگئی۔ جنریٹر کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ بھی خراب ہے۔ انصاری صاحب نے سوچا، کیا یہ محض اتفاق ہے۔

آغا عمران نے اس فائل کا بغور مطالعہ کیا جس کی بنیاد پر انہیں اپنے نئے کیس کو حل کرنا تھا۔ اس بار انہوں نے ذرا مختلف انداز سے کام کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ انسپکٹر شعیب کو انہوں نے ایس ایس پی صاحب کی طرف بھیجا تھا تاکہ ان سے مشکوک افراد اور جگہوں کی ایک فائل لے آئیں۔ یہ کیس منشیات فروشوں کے سلسلے کا تھا۔ اطلاعات تھیں کہ موت کے سوداگروں نے اس بار بچوں کی زندگیوں سے کھیلنے کا پروگرام بنایا تھا اور اسکولوں کے اندر، اور باہر ایسی کھانے پینے کی چیزوں کی فروخت شروع کی تھی جن میں نشہ ملا ہوتا تھا۔ آغا عمران نے ذیشان کے ذریعے ایسی جگہوں سے کھانے پینے کے اشیاء کے نمونے حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ .... جواد نے اپنا کردار بخوبی نبھایا تھا اور انصاری صاحب اس سے مطمئن تھے۔ مس نائلہ جو اس ڈرامے میں، اداکاری سکھانے والی ایک ٹیچر کا رول کر رہی تھیں، جواد سے خاصی متاثر تھیں۔ ریہرسل ختم کرنے کے بعد ایک بچے نے جواد کے منع کرنے کے باوجود ایک ٹافی کھائی اور بے ہوش ہوگیا۔ اسے ٹی وی اسٹیشن کی وین میں فوراً ہسپتال پہنچایا گیا۔ جواد نے آغا عمران صاحب کو فون کیا اور جلدی سے ہسپتال پہنچنے کے لئے کہا۔

اب آپ آگے پڑھیئے

آغا عمران سخت پریشان تھے کیونکہ انسپکٹر شعیب سے وائرلیس پر رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔

اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی دوسری طرف انسپکٹر شعیب تھا۔

"سر...... مجھے افسوس ہے میں وہ فائل آپ تک نہیں پہنچا سکا۔ وہ، .... میں فائل لے کر واپس آرہا تھا کہ گاڑی پر خود کار اسلحہ سے فائرنگ کر دی گئی۔ میں نے فائل کے ساتھ چھلانگ لگا دی...... لیکن...... ان تمام لوگوں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔" "لیکن انسپکٹر شعیب...... میں نے تمہارے پیغام کے ساتھ ہی یہاں سے پولیس فورس تمہارے پیچھے روانہ کی تھی کہ تمہاری حفاظت کی جائے اور ان لوگوں کو پکڑنے کی کوشش کی جائے" .... "جی سر...... اس پولیس فورس کی وجہ سے میری جان بچ گئی لیکن فائل۔"

"فائل کی فکر نہ کرو...... میں ایک مہینے کی تنخواہ اس شخص کو دے سکتا ہوں، جو مجھے اس شخص کے چہرے کے تاثرات کا فوٹو گراف لا دے جس نے یہ فائل چوری کرائی ہے۔ وہ تاثرات جب وہ اس فائل کو دیکھے گا۔"

"تم آرام کرو...... زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔ ٹھیک ہے میں تم سے کل بات کروں گا۔ ابھی میں جنرل ہسپتال جا رہا ہوں۔ وہاں ایک بچہ ایمرجنسی میں آیا ہے جس نے نشہ آور ٹافی کھائی ہے۔"

آغا عمران کو یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی، کہ ٹافی کھانے سے بچہ بے ہوش کیسے ہوگیا۔ حالانکہ نشہ آور ٹافی سے تو ٹافی کی طلب بڑھنی چاہئے تھی۔ کہیں غلطی سے ٹافی میں دوائی کی مقدار زیادہ پڑ گئی یا

............وہ مختلف ممکنات پر غور کر رہے تھے۔ ان کی جیپ تیزی سے ہسپتال کی طرف جا رہی تھی۔ وہاں جا کر انہیں پتہ چلا کہ بے ہوشی کی ایک وجہ سر میں لگنے والی چوٹ بھی ہے۔ آغا عمران نے انصاری صاحب سے اجازت لے کر ٹافی کھانے والے بچے اور جواد کو اپنی گاڑی میں بٹھالیا کہ وہ انہیں اس کے گھر خود چھوڑ دیں گے۔ آغا صاحب کا مقصد یہ تھا کہ بچے کے والدین سے بھی مل لیں گے اور یہ بھی پتہ کریں کہ وہ کہاں پڑھتا ہے اور اس نے یہ ٹافی کہاں سے خریدی تھی۔

آج جواد کی ان ڈور ریکارڈنگ کا دن تھا۔ چلڈرن کلب کے دفتر کا سیٹ لگایا گیا تھا۔ جواد دیکھ کر حیران ہوا کہ اسٹوڈیو کے ایک کونے میں دفتر کا تاثر اس طرح بنایا گیا تھا کہ بالکل اصلی دفتر لگ رہا تھا۔ چند تختے ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر کھڑے کر دیئے گئے تھے۔ سامنے میز اور کرسیاں رکھی تھیں۔ میز پر ضروری سامان رکھ دیا گیا تھا۔ کیمرے کی آنکھ اس منظر کو ٹی وی پر بالکل سجے سجائے دفتر کی صورت میں پیش کر رہی تھی۔

ریکارڈنگ ہوئی اور حسبِ معمول وہ دوبارہ ٹی وی کی وین میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہونے لگے تو مس نائلہ نے جواد سے کہا،

"تم میرے ساتھ گاڑی میں چلو...... میں تمہیں گھر چھوڑ دوں گی۔" جواد نے انصاری صاحب کو بتادیا کہ وہ ٹی وی کی وین کی بجائے مس نائلہ کے ساتھ جا رہا ہے۔

نائلہ دراصل ان انہونی باتوں کی وجہ سے جواد میں دلچسپی لے رہی تھی جو جواد سے وابستہ تھیں۔ اس لئے وہ تفصیل کے ساتھ اس سے باتیں کرنا چاہتی تھی۔ راستے میں بھی وہ اس سے پوچھتی رہی کہ وہ اس دن تم نے ٹافی کھانے سے منع کیا اور وہ بچہ ٹافی کھا کر بے ہوش ہو گیا۔ وہ انصاری صاحب بتا رہے تھے کہ تم نے بجلی چلے جانے کا پوچھا اور ساتھ ہی بجلی چلی گئی۔ اس طرح کے کئی ایک واقعات بچوں میں تمہارے بارے میں مشہور ہیں............ اس کے پیچھے کیا چکر ہے......

جواد نے کہا "چکر تو کچھ نہیں۔ غالباً اتفاقات ہیں یا بقول آغا عمران صاحب کے میری چھٹی حس ذرا تیز ہے اور میں خطرے کی بو کو سونگھ لیتا ہوں۔"

"میں بھی آج کل ایک کتاب پڑھ رہی ہوں۔" مس نائلہ نے کہا "اس کا نام ہے ای۔ ایس۔ پی یعنی ایکسٹرا سینسری پرسیپشن (Extra Sensory Perception)
ہم اسے مافوق الفطرت قوت ادراک بھی کہہ سکتے ہیں۔ تم اسے مافوق الفطرت قوت ادراک بھی کہہ سکتے ہو۔

"یہ اتنے موٹے موٹے لفظ تو میری سمجھ میں نہیں آ رہے لیکن آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ مجھے کہاں لے جا رہی ہیں؟" جواد نے باہر جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"اپنے گھر" .... مس نائلہ نے جواب دیا۔

"میرے ابو تم سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"تمہارے ابو کیا کام کرتے ہیں؟" جواد نے پوچھا۔

"بزنس۔"

"کیا بزنس؟"

"وہ تو میں بھی نہیں، جانتی۔ بس یہ معلوم ہے کہ وہ بزنس کرتے ہیں۔ کبھی ہم نے پوچھا ہی نہیں۔"

"اور آپ کی امی؟" جواد نے پوچھا۔

"وہ سوشل ورکر ہیں۔ خواتین کی مختلف انجمنوں کی سرپرست ہیں۔ بچوں اور بیوہ خواتین کے۔لئے انہیں کام کرنے کا عشق ہے۔" "کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ میں آپ کے ابو سے آج کی بجائے کل مل لوں گا؟"

"وہ کیوں؟" مس نائلہ نے پوچھا۔

"اس۔لئے کہ آج مجھے بہت ضروری کام ہے۔ میرے گھر میں میرا ایک دوست آنے والا ہے۔ اور پھر ہم دونوں نے مل کر ایک شو دیکھنے جانا ہے۔ وہ آپ کو بھی پتا ہو گا، وہ چائنا سے بازی گروں کا طائفہ آیا ہے۔ آپ مجھے پلیز گھر اتار دیں۔ کل آؤٹ ڈور کے بعد میں آپ کے ساتھ آپ کے گھر چلوں گا...... اور پھر میں اپنے امی ابو کو بتا بھی آؤں گا، کہ میں ریکارڈنگ سے فارغ ہو کر ذرا دیر سے آؤں گا۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" نائلہ نے کہا۔ "تو پھر یہ بتاؤ کہ تمہارا گھر کہاں ہے؟"

جواد نے باہر دیکھا اور کہنے لگا "وہ سرخ کار کے پیچھے موڑ لیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ کدھر جانا ہے۔"

"ارے یہ سرخ کار تو ہماری ہے۔ لیکن اسے کوئی اور ہی چلا رہا ہے!" نائلہ نے اپنی گاڑی سرخ کار کے قریب کی تو جواد نے گاڑی کا نمبر نوٹ کر لیا۔

جواد کے گھر، ذیشان اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"میرے سپر اسٹار، تمہاری شوٹنگ ختم ہو گئی۔" ذیشان نے جواد کو دیکھتے ہی کہا۔

"شوٹنگ تو ختم ہو گئی تھی لیکن میں تمہیں ایک اور بات بتاتا ہوں۔" جواد کی امی نے، جو ذیشان کے ساتھ بیٹھی، ہوئی مسکراتے ہوئے جواد کی طرف دیکھا...... کہ اب شروع کوئی نئی کہانی .... کوئی نئی گپ...... جس کا کوئی سر ہو گا نہ پیر............ جواد نے ذیشان کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے کمرے میں لے آیا۔

"پتا ہے کیا ہوا؟ وہ مس نائلہ ہیں ناں! وہ مجھے زبردستی اپنے گھر لے جا رہی تھیں۔ پتہ نہیں کیوں ان کے ابا مجھ سے ملنا چاہتے ہیں...... ان کے ابا کا بزنس بھی کچھ مشکوک ہے۔ کچھ پتہ نہیں کہ وہ کیا کرتے ہیں،

نائلہ کو بھی نہیں پتا کہ ان کے ابا کیا کرتے ہیں اور راستے میں ایک مشکوک سی کار دیکھی تو کہنے لگیں۔ یہ ہماری کار ہے اور پھر خود ہی بتانے لگیں کہ پتہ نہیں اسے کون چلا رہا ہے۔ یار ذیشان ...... مجھے تو سخت گڑبڑ لگتی ہے۔ کل ریکارڈنگ کے بعد تقریباً چھ بجے میں مس نائلہ کے ساتھ ان کے گھر جاؤں گا اور معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ ان کے والدین کیا کرتے ہیں اور سرخ کار کا کیا معاملہ ہے۔ ممکن ہے وہ تو مس نائلہ ہی بتا دیں۔ اگر کل آٹھ بجے تک میں گھر نہ پہنچوں تو تم انکل کو بتا دینا اور انصاری صاحب ٹی وی پروڈیوسر سے مس نائلہ کا پتہ لے کر ان کے گھر پہنچ جانا۔ بلکہ نہیں، میں کوشش کروں گا کہ کسی طرح مس نائلہ کے گھر کا پتہ معلوم کرلوں اور کل کسی وقت ٹیلی فون پر تمہیں بتا دوں۔ اگر میرا ٹیلی فون تمہیں نہ ملے تو پتہ انصاری صاحب ہی سے ملے گا۔"

○

ذیشان کو نیند نہیں آرہی تھی۔ معلوم نہیں کیوں وہ جواد کی طرف سے فکر مند تھا۔ آخر اسے کیا پڑی ہے کہ خطرناک لوگوں کے گھروں میں جائے۔ پھر خود ہی وہ خود کو سمجھانے لگا۔ "شاید اس سے ابو کا مسئلہ حل ہو جائے، اور زہریلی ٹافیاں بیچنے والوں کا پتہ چل جائے۔ ممکن ہے وہ ٹافی مس نائلہ نے ہی اس بچے کو دی ہو۔ لیکن ابو بتا رہے تھے کہ اس نے ٹافی خود خریدی تھی۔ اپنے گھر سے باہر کسی پھیری والے سے۔ اور پھر ذیشان نے مختلف اسکولوں کے باہر سے جو ٹافیاں، آئس کریم اور دوسری کھانے پینے کی اشیاء خریدی تھیں، ان سب کی رپورٹ ٹھیک آئی تھی یعنی ان میں نشہ آور دوا شامل نہ تھی شائد ان لوگوں کو بھی پتہ چل گیا ہے کہ پولیس ان کے تعاقب میں ہے اور وہ چھپ گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ اسکولوں کی بجائے گلی کوچوں اور محلوں میں پھیل گئے ہوں۔"

ذیشان نے یہ سب سوچتے ہوئے پھر جواد کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ "اللہ کرے جواد کسی ایسی بات کا پتہ چلالے کہ اس سارے کام کے پیچھے جو بڑا آدمی ہے وہ کون ہے، ان کا باس ...... سردار...... وہ پکڑا جائے، اس کے ابو کتنے خوش ہوں گے۔"

○

"میری خوشی کی وجہ ایک ٹافی ہے...... لڑکے!"

آغا عمران نے انسپکٹر شعیب کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا .... "صرف ایک ٹافی، کہ اخبار کا اداریہ غلط نہیں تھا۔ اب میرے ہاتھ ایک ثبوت آگیا ہے۔ بات درست ہے کہ بچوں کو ٹافیوں کے ذریعہ زہر دیا جا رہا ہے۔ اب میں انہیں نہیں چھوڑوں گا۔ کیا تمہیں اس سرخ کار کے بارے میں کوئی اور معلومات ملیں۔ اس کا نمبر؟ مالک؟" "جی نہیں۔" انسپکٹر شعیب نے کہا۔ "میں کوشش کر رہا ہوں، لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ کار دوبارہ نظر نہیں آئی۔" "ٹھیک ہے۔" آغا عمران نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"ابھی تو میں گھر جارہا ہوں .... تم مجھ سے ہر وقت رابطہ رکھو گے کہ کہاں ہو اور کیا کر رہے ہو۔"

اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، دوسری طرف ذیشان تھا۔

"ابو! آپ گھر کب آئیں گے۔ آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

"بیٹے ضروری بات ٹیلی فون پر بھی ہو سکتی ہے۔"

"ابو، ٹیلی فون پر صرف غیر ضروری باتیں ہوتی ہیں۔ ابھی کل ہی تو آپ امی سے کہہ رہے تھے۔"

"اچھا اچھا۔ ٹھیک ہے بتاؤ کیا بات ہے۔" آغا عمران نے پوچھا "ابو........... ہو سکتا ہے ہمارا ٹیلی فون کوئی سن رہا ہو، کسی دوسری لائن سے کراس بھی ہو سکتا ہے۔"

"میرے خدا،" آغا عمران نے اپنا سر پیٹ لیا، "یہ میرے گھر میں کیا چیز پیدا ہو گئی ہے۔"

"ابو۔ آپ کے سامنے انکل شعیب بیٹھے ہیں۔"

"جی بیٹھے ہیں۔" آغا عمران نے جواب دیا۔

"انہیں بھی ساتھ ہی لیتے آیئے گا۔ ورنہ آپ گھر سے آکر انہیں فون کریں گے۔"

"اچھا جی...... جو حکم سرکار کا۔" آغا عمران نے محبت سے کہا اور انسپکٹر شعیب سے کہنے لگے۔

"لڑکے! میرے بیٹے ذیشان نے تمہیں گھر طلب کیا ہے چلو چلتے ہیں، امید تو نہیں، شائد کوئی کام کی بات پتہ چل جائے۔ کیونکہ آج کل وہ بھی ہمارے کیس میں اتنا ہی ملوث ہے جتنے ہم ہیں۔"

"جی سر، اسکولوں کے باہر سے کھانے پینے کی اشیاء خریدنے میں اور پھر ہم تک پہنچانے میں اس نے بڑی محنت کی۔ جواب نہیں ذیشان کا" ....

اور چند لمحوں بعد وہ دونوں گھر پر تھے۔

ذیشان نے ان کو دیکھتے ہی ٹیلی فون نمبر گھمانے شروع کر دیئے۔ دونوں غور سے ذیشان کو دیکھ رہے تھے۔

"ہیلو انکل...... میں ذیشان بول رہا ہوں۔ جواد گھر آیا۔ ہاں یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ وہ آج ریکارڈنگ کے بعد کہیں جائے گا۔ بس یہی پتہ کرنا تھا کہ وہ گھر پہنچا یا نہیں۔" ذیشان نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

"جناب، ہمارے لئے کیا حکم ہے؟" آغا عمران نے شرارتاً کہا۔

"ہاں لڑکے، تم بیٹھو اور تم بھی بیٹھو۔" ذیشان نے اپنے ابا کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے جواد کے ساتھ تم نے بھی ڈراموں میں کام کرنا شروع کر دیا ہے۔"

"ہاں، جواد سے یاد آیا۔" ذیشان نے کہا، "آپ کو آج کل کسی سرخ کار کی تلاش تو نہیں ؟"

سرخ کار کا سن کر آغا عمران اور انسپکٹر شعیب یوں اچھلے تھے جیسے انہیں بھڑ نے کاٹ لیا ہو۔

"سمجھ گیا۔" ذیشان نے کہا اور پھر اپنی نیکر کی جیب سے ایک چھوٹا سا کاغذ کا ٹکڑا نکالا۔ "اس سرخ کار کا نمبر یہ ہے۔" اس نے کاغذ آغا عمران کی طرف بڑھا دیا جسے انسپکٹر شعیب نے آغا عمران کے ہاتھ سے تقریباً چھین لیا اور پھر خود ہی سوری کہہ کر نمبر پڑھنے لگا۔

"تمہیں سرخ کار کے بارے میں کس نے بتایا اور یہ نمبر تمہیں کس نے دیا ہے اور کار کا مالک کون ہے ؟"

آغا عمران نے دو تین سوالات اوپر نیچے کر دیئے۔

"اس کا مالک مس نائلہ کا ابو ہے۔"

"یہ مس نائلہ کون ہیں ؟" انسپکٹر شعیب نے فوراً پوچھا۔

"مس نائلہ جواد کے ساتھ ٹی وی ڈرامے میں کام کرتی ہیں۔"

"سمجھ گیا۔" آغا عمران نے کہا "وہ اس دن ہسپتال میں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔"

"کہاں رہتی ہے............ کوئی گھر کا پتہ ؟"

"ہاں یہ ہوئی ناں بات۔" ذیشان نے چہکتے ہوئے کہا۔

"یہ مجھے معلوم نہیں۔ البتہ یہ بتا سکتا ہوں کہ آپ کے دوست انصاری صاحب ٹی وی پروڈیوسر کے پاس مس نائلہ کا پتہ............ ہو سکتا ہے۔ بلکہ ہے۔ ساتھ ہی آپ سے درخواست ہے کہ میرا دوست جواد مس نائلہ کے گھر گیا ہوا ہے اور اس کی جان کو خطرہ ہے۔"

(جاری ہے)

گدھے غریبوں کی سواری ہیں، اس لئے ان میں میٹر نہیں ہوتا۔ انہیں ڈرائیو کرنے کے لئے لائسنس کی ضرورت نہیں۔ وہ پیٹرول پر نہیں چلتے، اوور ٹیک نہیں کرتے اور نہ دھواں چھوڑتے ہیں۔ اگرچہ وہ گیئر ہارن، ہیڈ لائٹ، کلچ اور بریک، کی ضرورتوں سے بے نیاز ہیں، پھر بھی وہ کبھی حادثہ نہیں کرتے۔ ان کا کوئی پارٹ اسپیئر نہیں ہوتا۔ جب سے وہ اس دنیا میں آئے ہیں ان کا ایک ہی ماڈل رہا ہے ان کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر ٹیکس لگانے والوں نے انہیں کبھی اپنی سرپرستی کے قابل نہیں سمجھا۔ ٹیکسیاں دس کام کرنے کے بعد ریٹائر ہو جاتی ہیں اور کباڑیوں کے ہاتھ بیچ دی جاتی ہیں لیکن بیس پچیس سال تک ملک و قوم کی خدمت کرنے کے باوجود کوئی گدھا آج تک پینشن پر نہیں گیا، نہ کسی کباڑیئے یا سیکنڈ ہینڈ ڈیلر کے یہاں دیکھنے میں آیا۔

محمد رضوان ...... کراچی

محسنِ صحافت

علی گوہر چوہان

پاکستان کو انگریزوں کی غلامی کے چنگل سے آزاد کرانے کے لئے جن لوگوں نے انتھک کوشش کی۔ ان میں مولانا ظفر علی خان" کا نام بہت نمایاں ہے۔ مولانا ظفر علی خان" رنگا رنگ صلاحیتوں اور گونا گوں خصوصیات کے حامل ایک بلند پایہ شاعر ایک باضمیر صحافی، جنگ آزادی کے اولوالعزم مجاہد اور ایک بے باک سیاسی رہنما تھے۔ ان کی ساری عمر انگریزوں اور ہندوؤں کے خلاف جہاد میں گزری۔ سچ بولنے کے جرم میں کئی بار جیل بھی گئے۔ لیکن حق کو حق کہنے سے باز نہ آئے۔ چنانچہ عمر عزیز کے قریباً ۱۵ سال انہوں نے جیل میں گزارے۔ مولانا ظفر علی خان نے جس انداز سے اردو صحافت کو ترقی دی اور اسے اوج کمال تک پہنچایا۔ اس بنا پر ان کا شمار اردو صحافت کی محسنوں میں ہوتا ہے۔

مسلمانوں کے یہ عظیم شاعر اور صحافی سیالکوٹ کے ایک گاؤں "کوٹ میرٹھ" میں ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں ہی حاصل کی۔ اس کے بعد علی گڑھ کی مشہور مسلم یونیورسٹی سے بی اے کا امتحان پاس کیا اور ملازمت کی غرض سے حیدر آباد چلے آئے۔ پڑھنے لکھنے کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ مولانا شبلی نعمانی اور پروفیسر آرنلڈ کی صحبت سے تربیت ملی۔ چنانچہ تعلیمی سیشن کے دوران "کالج میگزین" کے مدیر کی حیثیت سے بھی فرائض سرانجام دیتے رہے۔

حیدر آباد دکن میں آپ "دارالترجمہ" میں ملازم ہوگئے۔ اس ملازمت کے دوران مولانا ظفر علی خان نے کئی کتابوں کے انگریزی سے اردو میں ترجمے کئے اور بہت مقبولیت حاصل کی۔ ایک کتاب کے ترجمہ کرنے پر نظام حیدر آباد نے انہیں تین ہزار روپے اور پنجاب یونیورسٹی پانچ سو روپے کے انعام سے نوازا جو کہ اس زمانے کے لحاظ سے خاصی بڑی رقم تھی۔

حیدر آباد میں مولانا کی یہ علمی سرگرمیاں زیادہ دیر جاری نہ رہ سکیں۔ ۱۹۰۸ء کے لگ بھگ کی بات ہے کہ برطانیہ سے ایک ڈرامہ پارٹی حیدر آباد آئی اور سرکاری انتظام میں اس نے ناچ رنگ کا پروگرام پیش کیا۔ پروگرام کے اختتام پر مولانا ظفر علی خان سے کہا گیا کہ وہ حکومت کی طرف سے اس پارٹی کا شکریہ ادا کریں۔ اس خواہش کے جواب میں مولانا ظفر علی خان نے جو کچھ کہا وہ ان کی اسلامی حمیت اور حق گوئی کا بے مثال نمونہ تھا۔ آپ نے بھرے مجمع میں کھڑے ہو کر کہا "یہ نیم برہنہ رقص، بے حیائی اور بے غیرتی کا مظاہرہ انگریزی تہذیب میں تو برداشت کیا جاسکتا ہے لیکن میرا ضمیر اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ میں ایسے حیا سوز مظاہروں کا شکریہ ادا کروں۔" مولانا ظفر علی خان کی یہ حق گوئی حیدر آباد کے انگریز ریذیڈنٹ کو ناگوار گزری۔ اور اس نے مولانا کو حیدر آباد سے نکال دیا۔

حیدر آباد سے نکل کر آپ کرم آباد گجرات چلے آئے۔ جہاں سے آپ کے والد "زمیندار" کے نام سے ایک ہفت روزہ اخبار نکالتے تھے۔ دسمبر ۱۹۰۹ء میں آپ کے والد کا انتقال ہوگیا۔ باپ کی وفات کے بعد مولانا اخبار کے ایڈیٹر بنے۔ اس کا دفتر لاہور منتقل کر دیا۔ ۵ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو آپ نے "زمیندار" کو روزنامہ بنا دیا۔ جلد ہی زمیندار برصغیر کا سب سے کثیر الاشاعت اخبار بن گیا۔ آزادی وطن اور آزادی صحافت کے لئے زمیندار نے جو خدمات سرانجام دیں وہ ہماری تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایک لمبے عرصے تک یہ اخبار برصغیر کے مسلمانوں کی آواز، ان کا سب سے بڑا اتر جمان بنا رہا۔ انگریزوں نے اس اخبار کی اشاعت کو روکنے کے لئے لاکھ جتن کئے۔ کئی بار اخبار پر پابندی لگائی اور مولانا کو گرفتار کیا۔ لیکن اخبار "زمیندار" ہر بار ایک نئی آن اور طنطنے سے نکلتا تھا اور برصغیر کے مسلمانوں میں ایک نئی روح پھونکتا تھا۔ اور انگریزوں اور ہندوؤں کی شاطرانہ چالوں کو بے نقاب

کرتا تھا۔ اردو کے مشہور ادیب اور شاعر مولانا حالی نے مولانا ظفر علی خان کی خدمات کو اس طرح سے خراج تحسین پیش کیا ہے۔

اے مالک دفتر زمیندار
اے نازش قوم فخر اقراں
اے دین کے امتحان میں جانباز
اے نصرت حق میں تیغ عریاں
اے صدق و صفا کی زندہ تصویر
اے شیر دل ظفر علی خان
زندہ ہے وہ ملک و ملت
ہوں زندہ دل ایسے جس میں انسان

تحریک پاکستان میں مولانا نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انہیں ملکی اور بین الاقوامی حالات سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ ایک بلند پایہ خطیب اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کی شاعری اور نثر نگاری کا کل سرمایہ بین الاقوامی سیاست برصغیر کے مسلمانوں کی بیداری اور دینی حمیت کے موضوعات پر مشتمل ہے۔ وہ سچے شیدائی رسول اور داعی اسلام تھے خود کہتے ہیں۔

خدا کی حمد، پیغمبر کی نعت، اسلام کی عظمت
میرے مضمون ہیں جب سے شعر کہنے کا شعور آیا

تحریک خلافت اور قادیانی فتنہ میں مولانا کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ آپ جتنے اچھے شاعر تھے اتنی تقریر بھی کر سکتے تھے۔ گاندھی جی ظفر علی خان سے بہت گھبراتے تھے انہیں اگر کسی جگہ مولانا ظفر علی خان کے پہنچنے کی خبر ملی تو وہ وہاں سے اپنا قیام مختصر کر کے آگے چل دیتے تھے اسی بنا پر مولانا کو "آندھی بروزن گاندھی" کہا جاتا تھا کہ ایسی آندھی جو گاندھی کو اڑائے پھرتی ہے۔ اپنے ایک شعر میں گاندھی کی انہوں نے اس طرح خبر لی ہے۔

بھارت میں بلائیں دو ہی تو ہیں
اک سار کر، ایک گاندھی ہے
اک جھوٹ کا چلتا جھکڑ ہے
ایک مکر کی اٹھتی آندھی ہے

ہندوستان کے غلام باشندوں کو آزادی کی نعمت سے بہرہ ور کرنے کے لئے مولانا ظفر علی خان

کی شاعری نے بیش بہا خدمات سرانجام دیں۔ ان کی جرات و بے باکی نے دلوں میں آزادی کی شمع روشن کی۔ قائداعظم نے انہی کے بارے میں فرمایا تھا۔ "مجھے ظفر علی خان کی طرح پنجاب میں چند لوگ اور مل جائیں تو پھر مسلمانان ہند کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔

فی البدیہہ شعر کہنے میں اردو کا کوئی شاعر آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی زندگی میں اس طرح کے کئی واقعات ملتے ہیں جب انہوں نے موقع پر ہی فی البدیہہ اشعار کی ایک نظم تیار کر دی۔ ایک دفعہ قیام پاکستان کے بعد "حلقہ ارباب علم" کے زیر اہتمام گورنمنٹ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں ایک مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ مشاعرے میں بڑے بڑے شعرا کو مدعو کیا گیا تھا۔ سوائے ظفر علی خان کے۔ لیکن انتظام ایسا کیا گیا کہ ظفر علی خان مشاعرے میں شرکت ضرور کریں مگر ایک سامع کی حیثیت سے۔ چنانچہ ظفر علی خان پہنچ گئے۔ شاعروں کو طرح کا ایک مصرع دے دیا گیا تھا۔ اور تمام شعرا اپنا اپنا کلام لکھ کر لائے۔ مشاعرہ جاری تھا۔ کچھ شاعر جب کلام سنا چکے تو اسٹیج سیکریٹری نے مولانا سے کلام سنانے کی فرمائش کر ڈالی۔ خیال یہ تھا کہ چونکہ مولانا کو طرح کے مصرع کا علم نہیں تھا اور وہ اپنا کلام لکھ کر نہیں لائے ہوں گے۔ لہٰذا اسٹیج پر آکر معذرت کریں گے تو ان کی خوب سبکی ہوگی۔ دراصل اس زمانے میں کچھ شعرا کی مولانا سے ان بن چلی آتی تھی اور اس کا مقصد صرف مولانا پر اپنی برتری جتانا تھا۔

خیر مولانا اسٹیج پر پہنچے۔ شیروانی اور پگڑی پہن رکھی تھی۔ شیروانی کی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور شعر پڑھ دیا۔ واہ، واہ پورے پنڈال میں دھوم مچ گئی۔ کیا غضب کا شعر تھا۔ اس کے بعد مولانا نے دوسرا، تیسرا اور چوتھا شعر پڑھا۔ اور اس طرح بارہ پندرہ اشعار پر مشتمل ایک نظم پڑھ ڈالی لوگوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ ایک ایک شعر پر دل کھول کر داد دی۔ ادھر اسٹیج پر بیٹھے شعرا ہکابکا تھے سوچا کیا تھا اور ہو کیا گیا۔ مولانا پورے مشاعرے کو لوٹ کر لے گئے تھے۔ نظم سنانے کے بعد مولانا اپنی نشست پر آکر بیٹھ گئے تھے۔ ان کے ساتھ شاہد احمد دہلوی بیٹھے تھے۔ کہتے ہیں "میں نے مولانا سے وہ کاغذ مانگ لیا جس پر وہ اشعار لکھ کر لائے تھے مگر یہ دیکھ کر سشدر رہ گیا کہ کاغذ بالکل کورا تھا۔ چنانچہ میں نے اسی وقت بھرے مجمع میں کھڑے ہو کر کاغذ لہرا دیا اور اعلان کیا کہ مولانا نے اس وقت جو غضب کے اشعار سنائے تھے وہ فی البدیہہ تھے۔ سارا پنڈال حیرت زدہ رہ گیا۔ مشاعرے کے بعد ان تمام شعراء نے مولانا کے آگے جاکر ہاتھ جوڑ دیئے کہ آپ ہمارے استاد، آئندہ ہماری توبہ۔

آخر میں ایک دلچسپ واقعہ سن لیجئے۔ ہندوستان میں ۱۹۴۵ء کے انتخابات ہو رہے تھے۔ قائد اعظم اور دوسرے مسلم لیڈروں کے پرزور اصرار پر مولانا ظفر علی خان بھی لاہور سے مسلم لیگ کی ٹکٹ پر کھڑے ہوگئے۔ کانگریس نے مولانا کے مقابلے کے میں جس امیدوار کو کھڑا کیا وہ ایک مسلمان سنار تھا۔

میاں عبدالعزیز اس کا نام تھا۔ بڑا مالدار عیاش آدمی تھا۔ لوگوں نے کوشش کی کسی طرح وہ مولانا کے حق میں بیٹھ جائے مگر وہ نہ مانا بلکہ الٹا پیشکش کرنے لگا کہ مولانا جتنے چاہیں پیسے مجھ سے لے لیں اور میرے حق میں بیٹھ جائیں۔

خیر جب بیل منڈھے چڑھتی دکھائی نہ دی تو مولانا نے ایک رباعی لکھ ڈالی۔ اس کے تین مصرع کچھ اس قسم کے تھے کہ اوئے میاں عبدالعزیز، اوئے کانگریس دی کنیز، اوئے تو ہیں کی چیز وغیرہ دوسرے دن یہ رباعی پورے شہر میں زبان زد عام ہوئی۔ میاں عبدالعزیز شاہ عالمی میں رہتا تھا۔ اب جو گھر سے نکلا تو بچے بچے کی زبان پر یہ رباعی تھی۔ "اوئے میاں عبدالعزیز" اوئے کانگریس دی کنیز، اوئے تو ہیں کی چیز"۔ دو دن تو اس نے برداشت کیا تیسرے دن آکر مولانا ظفر علی خان کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ اور کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے انتخابات سے دست بردار ہو گیا اور یوں مولانا بلا مقابلہ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوگئے۔ عمر عزیز کے آخری ایام کرم آباد ضلع گجرات میں گزرے۔ اس زمانے میں بھی شعر کہنے کا یہ عالم تھا کہ کمزوری صحت کی بنا پر چار پائی پر بیٹھے ہوئے حقے کا ایک کش لگاتے اور شعر کہتے جاتے۔ ان کے صاحب زادے اختر علی خان پاس ہی بیٹھ کر شعر نوٹ کرتے جاتے۔

بالآخر یہ عظیم شاعر اور صحافی، ایک بلند پایہ خطیب اور مقرر ایک بے باک سیاسی رہنما اسلام کے اولوالعزم مجاہد، اعلیٰ درجے کے انشاپرداز اور ایک منفرد نثر نگار، ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء کو اس جہاں فانی سے کوچ کر گئے۔ "بہارستان"، "چمنستان"، نگارشات" اور ارمغان قادیان" ان کے مجموعہ ہائے کلام کے نام ہیں۔ انہیں ان کے آبائی گاؤں کرم آباد ہی میں دفن کیا گیا۔

بے شک ایک حق پرست شاعر کی حیثیت سے مولانا ظفر علی خان ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

پرندے ہماری کائنات کا حسن ہیں

پرندے نظامِ حیات کا جزوِ لازم ہیں

اِنہیں نہ ماریئے

انہیں ان کی فطری عمر تک جینے کا حق دیجیے

دریچۂ حیرت

سائنسی موضوعات پر سوال و جواب کا سلسلہ

س ...... چاند پر جانے والے سائنس دان کیا وہاں پر آگ جلانے کا تجربہ کر چکے ہیں۔ ؟

سید مراد علی شاہ۔ بکیر اشریف۔ ٹنڈو والہ یار

ج ...... ہم نے گزشتہ شمارے میں آپ کو آکسیجن گیس کے بارے میں بتایا تھا۔ یہ وہ گیس ہے جو خود تو نہیں جلتی لیکن جلنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ چاند پر چونکہ کسی قسم کی فضا نہیں لہٰذا آکسیجن بھی غیر موجود ہے اور اس کے بغیر جلنے کا عمل نہیں ہو سکتا۔

.... ○○ ....

س ...... چاند پر انسان کا وزن کم کیوں ہو جاتا ہے؟

فوزیہ عباس۔ فیڈرل بی ایریا۔ کراچی

ج ...... آپ کے اس سوال کا جواب ہم پہلے بھی دے چکے ہیں۔ آپ کی معلومات کے لئے ایک بار پھر بتاتے چلیں کہ چاند کی کشش ثقل جسے قوت تجاذب بھی کہتے ہیں زمین کے مقابلے میں چھ گنا کم ہے۔ کم کیوں ہے۔ ؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ چاند ہمارے زمین کی نسبت بہت چھوٹا ہے لہٰذا اس کی قوت تجاذب بھی زمین کے مقابلے میں اسی لحاظ سے کم ہے۔ مستقبل میں چاند پر اولمپک مقابلے ہوئے

تو کم از کم چھلانگ لگانے کے مقابلوں میں نہایت حیرت انگیز ریکارڈ بنیں گے۔ زمین پر آٹھ فٹ اونچی چھلانگ لگانے والا کھلاڑی چاند پر ۴۸ فٹ اونچی چھلانگ لگا سکے گا۔ پچیس تیس فٹ اونچی چھلانگ کا تو کیا ہے۔ وہ تو شاید ہم بھی لگالیں۔

○○

فضائی آلودگی سے کیا مراد ہے؟

شیخ عاکف حمید۔ کاموں کے

فضائی آلودگی آج کی دنیا کا بہت بڑا مسئلہ ہے جسے حل نہ کیا گیا تو کرۂ ارض کا مستقبل خطرے میں پڑ جائے گا۔ کارخانوں کی چمنیوں اور سڑکوں پر دوڑنے والی سواریوں سے خارج ہونے والا دھواں فضائی آلودگی میں روز بروز اضافے کا موجب بن رہا ہے۔ اسی طرح مختلف اشیاء کے جلنے سے جو دھواں پیدا ہوتا ہے وہ بھی ہماری فضاء کو آلودہ کرتا ہے۔ جنگلوں میں لگنے والی آگ اور آتش فشاں پہاڑوں سے نکلنے والی، راکھ، گیس اور دھواں بھی بہت وسیع پیمانے پر آلودگی پیدا کرتا ہے۔ ان سب باتوں سے ہماری فضاء روز بروز کثیف اور غلیظ ہوتی جارہی ہے اور اسی فضاء میں ہم سانس لیتے اور پھلتے پھولتے ہیں۔ لہٰذا، ماہرین کی رائے میں بڑے اور گنجان آباد شہروں کے رہنے والے بہت کثرت سے گلے اور سانس کے امراض میں مبتلا پائے جاتے ہیں۔

فضائی آلودگی کی وجہ سے زمین کا درجۂ حرارت بھی بڑھتا جارہا ہے اور اگر اس کے بڑھنے کی یہی رفتار رہی تو درجۂ حرارت میں اضافہ سے قطبین پر جمی ہوئی برف پگھل جائے گی۔ اس کے نتیجے میں سمندروں کی سطح بلند ہو جائے گی اور ساحلی شہر اور علاقے زیر آب آجائیں گے۔

یہ آنے والے دنوں کی ایک بھیانک تصویر ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ ماہرین کو وقت پر ان باتوں کا اندازہ ہو گیا ہے اور ساری دنیا میں آلودگی کے خلاف جہاد شروع ہو گیا ہے۔ ہم اپنے طور پر یہ کر سکتے ہیں کہ جگہ جگہ آگ نہ لگائیں۔ دھواں نکلنے والی سواریوں کو سڑکوں پر نہیں لائیں۔ اس کے ساتھ ایک ضمنی بات یہ ہے کہ درخت اور پیڑ پودے بھی آلودگی کے خلاف جنگ کرتے ہیں۔ لہٰذا زیادہ سے زیادہ درخت لگائے جائیں۔ یہ بھی آلودگی پر قابو پانے کا ایک طریقہ ہے۔

○○

پس ...... وہ کون سی قوت ہے جو ہوا کو متحرک کرتی ہے؟

برادارم، آپ کا یہ سوال ہمارے پاس ایک عرصے سے رکھا ہوا تھا۔ لیجئے آج آپ ہی کے سوال کی باری ہے۔ جسے ہم ہوا کہتے ہیں وہ دراصل مختلف گیسوں کا ایک مجموعہ ہے جو ایک

غلاف کی طرح کرہ ارض پر ہر سمت پھیلا ہوا ہے۔ سورج جیسا کہ آپ جانتے ہیں توانائی کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ دن کے وقت سورج کی کرنیں زمین کی سطح اور سمندروں کے پانی کو گرم کر دیتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں قریب کی ہوا گرم ہو جاتی ہے اور سائنس کے اصول کے تحت گرم ہو کر اوپر اٹھ جاتی ہے۔ اس ہوا کی جگہ لینے کے لئے ٹھنڈی ہوا آجاتی ہے جو تھوڑی دیر میں گرم ہو کر خود بھی اوپر چلی جاتی ہے اور یوں یہ سلسلہ جاری و ساری رہتا ہے۔

ساتھ ساتھ آپ کو یہ بھی بتاتے چلیں کہ ہوا کی طاقت ناپنے والے آلے کو انیمومیٹر کہتے ہیں اور ونڈ وین نامی آلے سے اس کی سمت کا درست تعین کیا جاتا ہے۔

○○

پہاڑ کیسے بنے؟ پہاڑ قدرت کی تعمیر کے بڑے شاندار نمونے ہیں۔ عام لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ یہ پہاڑ ہمیشہ سے اسی طرح سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ لیکن پہاڑوں کا مطالعہ کرنے والے ماہرین ارضیات اور سائنس دانوں کا خیال ہے کہ پہاڑوں میں تبدیلی آتی رہتی ہے اور وہ ہمیشہ قائم رہنے والے شاہکار نہیں ہیں۔

زمین کی سطح پر ہونے والی چند تبدیلیوں سے پہاڑ بنتے ہیں اور اسی طرح کی تبدیلیوں کے نتیجے میں وہ ٹوٹتے بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں۔ برفیلے پانی کی وجہ سے بڑی بڑی چٹانیں ٹوٹتی رہتی ہیں۔ برساتی نالوں کی وجہ سے مٹی اور چٹانوں کے ٹکڑے بہہ جاتے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے پہاڑ بھی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں یا میدانوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

ماہرین ارضیات پہاڑوں کو چار درجوں میں تقسیم کرتے ہیں تمام پہاڑ سطح ارضی پر رونما ہونے والی شدید تبدیلی کا نتیجہ ہیں یہ تبدیلیاں لاکھوں سال پہلے رونما ہوئیں تھیں۔

تہہ دار پہاڑ ایک کے اوپر ایک جمی ہوئی چٹانوں کی پرت سے بنتے ہیں۔ یہ چٹانیں سخت دباؤ سے ایک دوسرے میں اس طرح مل جاتی ہیں کہ ایک بڑی چٹان کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اس طرح کے پہاڑ یورپ میں الپ کے پہاڑی سلسلے میں پائے جاتے ہیں۔ گنبد نما پہاڑوں میں چٹانیں گنبد کی طرح شکل اختیار کر لیتی ہیں جب کہ مختلف حصوں میں پہاڑ زمین کی سطح کی خامیوں سے وجود میں آتے ہیں آتش فشاں پہاڑ لاوا، راکھ اور جلنے والے مادے سے بنتے ہیں یہ سب کچھ آتش فشاں اپنے اندر سے باہر پھینکتا ہے۔ عام آتش فشاں چوٹی والے پہاڑ ہوتے ہیں۔ یہ چوٹی اوپر جا کر نوک دار ہوتی چلی جاتی ہے۔ ان کے درمیان میں ایک بڑا سوراخ ہوتا ہے جس سے یہ لاوا اگلتے ہیں ہمارے ملک کے شمالی علاقوں میں دنیا کے بلند ترین پہاڑ پائے جاتے ہیں۔

سبق

عفت گل اعزاز

عثمان، اشفاق اور عمران کی آپس میں بڑی دوستی تھی۔ یہ تینوں بچے بڑی شدت سے گرمی کی چھٹیوں کا انتظار کر رہے تھے کہ جب روز روز صبح اٹھ کر اسکول جانے کی مشکل نہ ہوگی، خوب گھومنا پھرنا، سیر کرنا اور کھیلنا ہوگا۔ سب سے اچھی بات یہ کہ بے فکری ہوگی اور خوب موجیں ہوں گی۔ مئی کا مہینہ دھیرے دھیرے کھسک رہا تھا۔ پھر جون کا گرم مہینہ آگیا بالآخر اسکول بند ہونے کا اعلان ہوا اور بچوں نے سکھ کا سانس لیا۔

عمران اور عثمان صبح سویرے اٹھ جاتے اور اشفاق بھی جلدی جاگ جاتا۔ پھر تینوں بچے صبح کی تازہ ہوا کھانے باہر نکل آتے۔ کبھی یہ لوگ صبح کی دوڑ یعنی جوگنگ کرتے کبھی چہل قدمی کرتے اور خوب

دیر تک صاف اور تازہ ٹھنڈی ہوا کا لطف اٹھاتے۔ صبح کی یہ مصروفیات انہیں تروتازہ کر دیتی۔ صبح کی چہل قدمی کے دوران ہی عمران نے کرکٹ میچ کے لئے تیاری کا منصوبہ بنایا۔ محلّہ کے لڑکوں نے ٹیم بنائی اور دوسرے محلّہ کے لڑکوں کے ساتھ میچ کھیلا گیا۔ ایک میچ کیا ہوا لوگ باگ صبح سے شام تک گلی میں کرکٹ کھیلنے لگے۔ صبح کرکٹ ہوتی جو دوپہر تک چلتی۔ تھوڑی دیر کے لئے کھانے کا وقفہ ہوتا۔ سہ پہر سے اگلا میچ شروع ہو جاتا جو مغرب کے بعد تک جاری رہتا۔

یہ جوش و خروش کچھ دن میں ٹھنڈا پڑ گیا۔ اب بچوں نے سوچا کہ کوئی اور کام کیا جانا چاہئے۔

عثمان کو کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ کہانیاں بڑے شوق سے پڑھتا تھا۔ اشفاق نے عثمان سے کہانیوں کی ایک کتاب پڑھنے کے لئے مانگی۔ کہانیاں اسے بہت پسند آئیں۔ اب یہ تینوں دوست نئی نئی کتابیں خریدتے پہلے ایک بچہ کتاب پڑھتا پھر دوسرے کی باری آتی اور پھر تیسرا بچہ کتاب لے لیتا۔ کچھ دن تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ لیکن اس میں پیسے بڑی جلدی خرچ ہو گئے۔ ایک دن اشفاق نے کہا "اگر ہم لوگ کسی لائبریری کے ممبر بن جائیں تو بڑا اچھا ہو۔ وہاں سے اچھی اچھی کتابیں پڑھنے کے لئے مل جائیں گی۔"

"ہاں اور پیسے بھی خرچ نہیں ہوں گے، لیکن لائبریری ہے کہاں؟"

"ہاں ہمارے گھر سے تھوڑی دور ایک لائبریری کھلی ہے، اس میں چلیں گے۔" اشفاق نے کہا۔

"ہاں ہاں .... وہ عمارت تو کافی دنوں سے بن رہی تھی اب مکمل ہو گئی ہو گی۔" عمران نے کہا۔

"یہ ٹھیک رہے گا۔ چلو کل ہی وہاں جا کر معلوم کرتے ہیں کہ کیا صورتحال ہے۔" اشفاق بولا۔

"کل آنے میں تو بڑی دیر ہے۔ چلو ابھی چلتے ہیں۔" عثمان نے جوشیلے لہجہ میں کہا۔

تینوں دوست لائبریری چلنے کو اٹھ کھڑے ہوئے۔

لائبریری کی عمارت بڑی خوش نما تھی۔ سامنے شیشے کی دیوار تھی اور ایک جانب بڑا سا دروازہ تھا۔ یہ لوگ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تو وہاں بہت سی الماریاں نظر آئیں جو کتابوں سے سجی ہوئی تھیں۔ بڑی بڑی میزوں کے گرد کرسیاں رکھی تھیں اور کرسیوں پر بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے کتابیں پڑھ رہے تھے۔ ایک طرف کاؤنٹر تھا جس پر ایک صاحب بیٹھے تھے۔ عثمان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کتاب کس

طرح لی جائے۔

"اٹھالیں کتاب ؟" عثمان نے آہستہ سے پوچھا۔ "نہیں۔ ایسے نہیں اٹھاتے ...... لائبریری میں ایک بندہ ہوتا ہے اس کی اجازت سے کتاب لیتے ہیں۔" عمران نے سمجھایا۔ وہ تینوں کاؤنٹر کے پاس پہنچے اور معلومات حاصل کیں۔ انہوں نے ممبر بننے کے لئے فارم انہیں دیا۔ فارم بھرنے کے بعد فیس دینی تھی اور پھر لائبریری کارڈ ملنے تھے۔

اس طریقہ کے مطابق تینوں بچے لائبریری کے ممبر بن گئے۔ کارڈ ملنے کے بعد تینوں نے المارای سے اپنی اپنی پسند کی کتابیں نکالیں اور انہیں اپنے نام جاری کروایا۔ جب وہ تینوں کتابیں سنبھالے لائبریری سے نکلے تو بہت خوش تھے۔ کتاب حاصل کرنے کی خوشی اور پھر اچھی کتاب پڑھنے کا خیال اور وہ بھی بغیر کتاب خریدے ہوئے۔ یعنی مفت میں۔ گھر پہنچتے ہی وہ تینوں کتابیں پڑھنے لگے۔ عمران کی کتاب میں بہت خوبصورت جانوروں اور پھولوں کی بڑی بڑی رنگین تصویریں تھیں۔ وہ کتاب ہاتھ میں لئے بیٹھا تھا کہ اس کا دوست جمال آگیا۔

"یار اتنی اچھی تصویریں ہیں۔ تم کتاب میں سے یہ تصویریں کاٹ لو۔ لائبریری والوں کو پتہ بھی نہ چلے گا۔" جمال نے کہا۔

"جب وہ کتاب دیکھیں گے تو انہیں پتہ چل جائے گا کہ تصویریں ہم نے نکالی ہیں۔" عمران نے جواب دیا۔

"نہیں یار .... کوئی نہیں دیکھتا۔ وہ کوئی چیک تھوڑا ہی کرتے ہیں۔" جمال نے اطمینان سے کہا۔ "میں نے کتابوں سے بہت تصویریں نکالی ہیں۔ میری باجی کالج میں پڑھتی ہیں وہ بہت اچھی اچھی کتابیں لاتی ہیں وہاں کی لائبریری سے۔ وہ خود بھی ان کتابوں سے ضروری کام کے صفحے کاٹ لیتی ہیں۔"

"اچھا!" عمران بہت حیران ہوا۔

"اور کیا اب کون پیسے خرچ کر کے کتاب خریدے۔ بس کام کے صفحے نکال لئے۔ مفت میں بات بن جاتی ہے۔" جمال ہنس کے بولا۔ "نکالو نکالو .... تم بھی تصویریں نکال لو............ مابدولت نے اجازت دے دی ہے" وہ مسخرے پن سے بولا "شکریہ عالم پناہ ! شکریہ ! یہ غلام ابھی آپ کے حکم کی تعمیل کرتا ہے۔" عمران نے ہنس کر کہا۔ کچھ دیر بعد جمال چلا گیا۔

شام کو کھیل کے میدان میں جب عمران، عثمان، اشفاق اکٹھے ہوئے تو انہوں نے جمال کا ذکر کیا اور کتابوں سے تصویریں کاٹنے کا مشورہ بھی یاد آیا۔

"تصویریں کاٹنا بہت غلط بات ہے۔ یہ تو کھلی چوری ہوئی۔" اشفاق بولا۔

"چوری کرنا تو بہت بُری بات ہے۔ اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔ میں تو کبھی نہ کاٹوں تصویر۔" عثمان بولا۔ وہ جانتا تھا کہ چوری بُرے لوگ کرتے ہیں۔ اچھے لوگ نہیں کرتے۔

"اور افسوس کی بات تو یہ ہے کہ اس کی باجی بھی اسی طرح کتابوں سے ورقے نکال لیتی ہیں۔" عمران بولا۔

"ہاں میں بھی ایک لڑکے کو جانتا ہوں۔ وہ ہماری کلاس میں پڑھتا ہے۔ اور وہ بھی کتابوں سے کاغذ نکال لیتا ہے۔ ایک دفعہ وہ پکڑا گیا۔ سر نے اسے خوب مارا اور ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس لے گئے۔"

"اچھا ہوا جو اسے سزا ملی۔ بُرے کاموں پر اگر سزا مل جائے تو بڑا اچھا ہوتا ہے۔ پھر انسان اس بُرے کام سے بچ جاتا ہے۔ ورنہ جب تک کوئی اسے پکڑے گا نہیں وہ تو بُرے کام کرتا ہی جائے گا۔"

"بلکہ عمر بھر کرتا رہے گا۔" اشفاق بولا .... اس نے دیکھا عمران کچھ سوچ رہا تھا۔

"یار تم کیا سوچنے لگے؟" اشفاق نے پوچھا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ جمال کو ایک سبق سکھایا جائے، تاکہ پھر وہ دوسروں کی کتابوں سے تصاویر اور مضمون نہ کاٹ سکے۔"

"وہ کس طرح؟" اشفاق نے پوچھا۔

"یہی تو سوچ رہا ہوں .... ہاں ایسا کرتے ہیں کہ ...." تینوں دوست مشورہ کرنے لگے۔

اگلے دن عمران اور اشفاق جمال کے گھر گئے۔ جمال نے انہیں اپنی کتابوں کی الماری دکھائی۔ الماری میں آٹھ دس کتابیں رکھی تھیں۔ "دیکھو .... یہ کتاب مجھے میرے ماموں نے لاکر دی تھی سالگرہ پر! کتنی اچھی ہے نا؟" جمال نے ایک کتاب دکھاتے ہوئے کہا۔ اس کتاب میں بڑی اچھی تصویریں تھیں۔

"ارے تم نے اور بھی تو بہت سی کتابوں سے تصویریں کاٹی تھیں نا؟"

"ہاں ہاں .... میرے پاس بہت تصویریں جمع ہیں!" جمال فخریہ بولا اور کئی ساری تصاویر دکھائیں جو کچھ سائنس دانوں کی تھیں کچھ ریل گاڑیوں، جہاز اور موٹر گاڑیوں کی تھیں۔

"یار تم نے جن کتابوں سے یہ تصویریں نکالی ہوں گی وہ کتابیں تو بیکار ہی ہو گئی ہوں گی!"

اشفاق بولا۔

"یار .... میری بلا سے کسی اور کی تھی نا کتاب ...... وہ بے شک سر پکڑ کے رویا ہو گا۔"

جمال نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔

"نقصان جب کسی دوسرے کا ہو تب ہمیں اس کا دکھ نہیں ہوتا۔ اگر ہمیں خود نقصان ہو تبھی احساس ہوتا ہے۔" عمران بولا۔

"اور چھٹیوں میں کیا کر رہے ہو؟" کیسی جاری ہیں چھٹیاں؟"

"اچھی جا رہی ہیں۔ کھیلتے بھی ہیں پڑھتے بھی ہیں۔" عمران نے جواب دیا۔

"اچھا یار سنو .... اپنی یہ کتاب دو گے پڑھنے کے لئے؟" اشفاق نے پوچھا۔

"ہاں یار لے لو۔ مگر سنبھال کے رکھنا۔" جمال نے کتاب اسے پکڑاتے ہوئے ہدایت کی۔

"ہاں ہاں کل یا پرسوں واپس کر دوں گا۔" اشفاق نے کہا۔

کتاب لے کر عمران اور اشفاق گھر واپس آ گئے۔ واپسی میں انہیں ہنسی آ رہی تھی۔ "اب سکھائیں گے اس کو سبق۔" عمران نے کتاب الٹ پلٹ کے دیکھی۔ کتاب بڑے اچھے کاغذ پر چھپی تھی۔ تصویریں بھی بڑی اچھی تھیں۔ ان دونوں نے کتاب پڑھی اور پھر اس کتاب میں سے پانچ بہترین تصویریں کاٹ لیں۔ تصویریں کٹنے کی وجہ سے ان کی جگہیں خالی ہو گئی تھیں اور دوسری طرف لکھی ہوئی تحریر ادھوری رہ گئی تھی۔ کتاب بالکل فضول لگ رہی تھی۔ یہ کام کرتے ہوئے ان دونوں کو افسوس ہو رہا تھا کہ کتاب کی گت ہی بن گئی تھی۔

اگلے دن وہ جمال کو چپکے سے کتاب واپس کر کے آ گئے اور اس سے کوئی ذکر نہیں کیا۔ لیکن یہ بات کب تک چھپتی۔ تقریباً ایک ہفتے بعد جمال آیا تو غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ "تم لوگوں نے میری کتاب خراب کی ہے!"

"کونسی کتاب؟ اور کیسی خرابی؟" اشفاق نے حیرت سے کہا۔ "یہ دیکھو! ساری کتاب کا ستیاناس مار دیا۔" جمال نے غصہ سے بولا۔ "کیا میں نے تم کو اس لئے کتاب دی تھی کہ تم اس کا یہ حشر کرو؟" جمال بولا۔

"کیوں غصہ کر رہے ہو، ساری کتاب تو ٹھیک ہے۔" عمران آرام سے بولا۔ "اچھا یہ ٹھیک ہے؟" اس نے ایسا صفحہ کھولا جس کے درمیان سے تصویر غائب تھی۔ "دیکھو .... سارا مضمون بگڑ گیا...... سچ بتاؤ تم نے نکالی ہیں تصویریں؟" جمال نے پوچھا۔ "اچھا تو تصویر نکالنے سے مضمون بگڑتا ہے

.... کتاب خراب ہوتی ہے...... کتاب کا حشر ہو جاتا ہے؟" عمران نے پوچھا۔ "اور کیا............ بے کار ہو گئی کتاب تو............ اتنی اچھی کتاب تھی؟" جمال تاسف سے بولا۔

"یار............ ہمیں افسوس ہے کہ ایسا ہوا............ دراصل یہ ایک بُری عادت ہے۔ کتاب سے کوئی ورق............ کوئی تصویر کاٹنی نہیں چاہئے؟ کیوں کہ اس سے نقصان ہوتا ہے! انسان کا نقصان .... کہ اس کی عادت خراب ہوتی ہے۔ وہ چوری کرنا سیکھ جاتا ہے اس کو چوری کرنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ اور ایک چیز کی چوری کرنے کے بعد ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اور چیز کی چوری کرنے لگے اس طرح وہ عادی مجرم بھی بن سکتا ہے!" عمران بولا۔

"یار تم کیا کہہ رہے ہو؟" جمال اکتا کر بولا۔

"یہ بتاؤ کہ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں؟" عمران نے پوچھا۔

"جی ہاں آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں!" جمال ذرا چڑ کر بولا۔

"دوسرا نقصان............ کتاب کا ہے۔ کہ وہ بے چاری بے کار، بد شکل............ اور ادھوری رہ جاتی ہے۔ وہ کتاب پھر اس لائق نہیں رہتی کہ کوئی اسے پڑھ سکے۔ اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ وہ کتاب بے کار ہو جاتی ہے؟ ہوتی ہے نا بے کار............ گویا کسی نے اس کتاب بے چاری کے ہاتھ پیر توڑ دیئے ہوں۔"

"ہاں۔" جمال بولا۔

"اور اگر غور کریں تو جس شخص کی کتاب تھی یہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا............ اس کی کتاب برباد ہو جائے تو اس کی چیز خراب ہوئی۔ اس کے پیسے بیکار گئے...... اس کا نقصان ہوا۔"

"ہاں............ ہوا نقصان، پھر؟"

"اور اگر بہت سے لوگ اسی طرح کتابوں کے ورق نکالتے رہیں۔ تصویریں چراتے رہیں .... تو بہت سی لائبریریاں خراب ہو جائیں۔ ان کی کتابیں بے کار، بے مصرف رہ جائیں...... اور لوگوں کے لئے کتابیں حاصل کرنا بیکار ہو جائے۔ اس طرح قومی خزانے کا بھی نقصان ہوا............ ہوا نا!"

"یار............ عمران میں سمجھ گیا کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ واقعی کتاب میں سے کوئی ذرا سا بھی کاغذ کا ٹکڑا نہیں کاٹنا چاہئے۔" جمال نے کہا۔

"بالکل درست سمجھے تم۔" عمران کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"بچو۔ اس بات سے تمہیں جو سبق ملا............ اسے یاد رکھنا!" اشفاق ہنس کر بولا۔

"ہاں یار............ میں آئندہ کبھی یہ کام نہ کروں گا!" جمال شرمندگی سے بولا۔

"تم نیک بچے ہو............ اس لئے آئندہ نیک کام ہی کرنا۔ لو تمہارے یہ نکلے ہوئے کاغذ تمہارے حوالے" .... عمران نے اس کو سب کٹی ہوئی تصاویر دے دیں۔ جمال انہیں دیکھ کر خوش ہو گیا۔

"آؤ ہم تینوں مل کر ان تصویروں کو دوبارہ ٹیپ اور گوند کی مدد سے کتاب میں چپکا دیتے ہیں۔"

"اچھا یار بس کرو۔" جمال بہت ہی شرمسار ہو رہا تھا۔

"تم جاؤ آدھے گھنٹے بعد ہم تمہیں یہ کتاب تمہارے گھر پہنچا دیں گے۔ جمال کے جانے کے بعد وہ تصاویر واپس دوبارہ کتاب میں چسپاں کر دی گئیں۔ کتاب اس طرح کچھ بد نما تو آگ رہی تھی مگر اب وہ کام آ سکتی تھی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ایک اور کتاب خراب ہو جاتی اور وہ لوگ کتاب کو محفوظ کرنا چاہتے تھے، اسے خراب نہیں کرنا چاہتے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ کتاب جمال کو واپس کرنے گئے۔

"یار تم نے مجھے اچھا سبق دیا۔" جمال نے کہا "اچھا دوست وہی ہے جو اپنے دوست کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے، اسے بُرے کام سے منع کرتا ہے۔" جمال نے شکر گزاری سے کہا۔ "دیکھ لو! آخر کو ہم تمہارے دوست ہیں نا!" عمران ہنس کر بولا۔ "بالکل!" جمال نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تینوں دوست باتیں کرتے ہوئے باہر چلے گئے۔

MASS

مشوروں کی دکان

نجمہ خان

بہت سال کی بات ہے کہ ایک گاؤں نیشاپور میں ایک عجیب و غریب دکان تھی۔ وہ مشوروں کی دکان کہلاتی تھی۔ نظیر نامی ایک شخص اس دکان کا مالک تھا۔ وہ بے حد ذہین اور عقل مند تھا۔ اس نے مختلف پرچیوں پر مختلف مشورے لکھ رکھے تھے۔ جیسا گاہک آتا اسے وہ ویسے ہی مشورے کی پرچی تھما دیتا۔ لیکن مفت نہیں۔ اس کے ہر مشورے کی قیمت ہوتی تھی۔ عام طور پر وہ ایک مشورے کے سو روپے لیا کرتا تھا۔ چونکہ مشورے خریدنے والوں کو بہت فائدہ ہوتا تھا اس لئے اس کی دکان پر گاہکوں کا ہجوم بڑھنے لگا تھا۔ لیکن نہیں معلوم کیسے نظیر کے پاس مشوروں کی کبھی کمی نہیں ہو سکی۔ لوگ دور دور سے

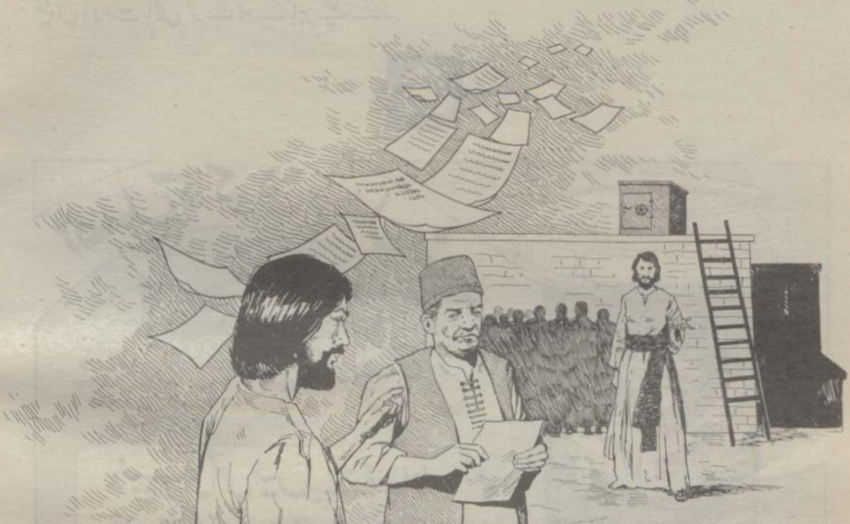

آتے اور مشورے لے کر نظیر کو دعائیں دیتے ہوئے جاتے اس لئے کہ انہیں یقین تھا کہ اس کے مشوروں کے نتیجے میں ان مسائل حل ہو جائیں گے۔

ایک دن نظیر کی دکان پر ایک سیٹھ آیا جو بہت امیر تھا۔ اس نے نظیر کی شہرت سن رکھی تھی۔ اس نے تین سو روپے دے کر تین مشورے خریدے۔ وہ مشورے یہ تھے۔

"سفر میں جاتے وقت بیوی کو وجہ نہیں بتانا چاہئے۔"

"راستے میں اگر کھانا کھانا ہو تو راستے سے ہٹ کر کسی سکون کی جگہ بیٹھ کر کھانا چاہئے۔"

"جلد بازی میں آکر کسی بارے میں بھی شرط نہیں لگانا چاہئے۔"

ویسے تو سیٹھ کو ان مشوروں میں کوئی خاص نکتے کی بات نظر نہیں آئی لیکن پھر بھی ان مشوروں کو آزمانے کے لئے اس کا دل بے چین تھا۔ چنانچہ اپنی بیوی سے بغیر کچھ کہے اس نے نو تھیلیوں میں نو ہزار روپے بھر لئے اور گھوڑے پر سوار ہو کر شہر میں تجارت کرنے کی غرض سے گھر سے نکل گیا۔

سفر کے دوران اس کے کھانے کا وقت ہو گیا۔ راستے سے تھوڑے فاصلے پر اس کو ایک کنواں نظر آیا۔ وہ گھوڑے سے اترا اور کنویں کے پاس بیٹھ کر کھانا کھا کر پھر دوبارہ سفر پر روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد اس نے تھیلیاں گن کر دیکھیں تو نو کی جگہ صرف آٹھ ہی تھیلیاں اسے ملیں۔ وہ واپس کنویں کے پاس گیا اور اپنی تھیلی ڈھونڈی تو تھیلی اسے وہیں پڑی مل گئی۔ روپے دے کر اس نے جو مشورے خریدے تھے ان میں سے ایک مشورہ بالکل درست نکلا تھا کیونکہ اگر اس نے راستے میں کھانا کھایا ہوتا اور اس حالت میں روپوں کی تھیلی گری ہوتی تو راہ چلنے والے لوگ اس کی تھیلی لے جا چکے ہوتے۔

سیٹھ روپوں کی تھیلی لے کر گھوڑے کے قریب آرہا تھا کہ کوڑے میں پڑا ایک پھل اس کے پیر سے ٹکرا گیا۔ اس کے پیر میں ایک پرانا پھوڑا تھا جو بہت تکلیف دیا کرتا تھا۔ اس نے جھک کر اپنے پیر کو دیکھا تو حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ کیونکہ پھوڑا حیرت انگیز طور پر غائب ہو گیا تھا۔ اور تکلیف بھی نہیں تھی۔ جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو۔

سیٹھ نے سوچا کہ اس پھل میں ضرور کچھ اہم فائدے ہیں اس پھل کو واپسی میں ساتھ لے جانا چاہئے۔ اس سے دوسرے بھی فائدے حاصل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اس نے پھل کو کنویں کے کنارے ایک جگہ مٹی میں دبا دیا۔ اور شناخت کے لئے ایک نشان رکھ دیا۔ سیٹھ کی شہر میں تجارت خوب اچھی ہوئی۔ اس نے بہت سے روپے کمائے اس خوشی میں وہ واپسی میں اس پھل کر ساتھ لینا بھول گیا جسے وہ کنوئیں کے کنارے میں دبا آیا تھا۔ گاؤں میں پہنچتے ہی اسے اطلاع ملی کے گاؤں کا چوہدری اپنے زخم کے ہاتھوں پریشان ہے جو اس کی ٹانگ پر پھوڑے کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ چوہدری نے اعلان کروایا ہے کہ جو اسے

تندرست کر دے گا وہ دس ہزار روپے کے انعام کا مستحق ہو گا۔ بہت سے حکیموں نے کوشش کر دیکھی لیکن ناکام رہے۔

یہ سنتے ہی سیٹھ کو یکایک پھل کا خیال آیا اس نے سوچا وہ پھل یقیناً چوہدری کا زہر بھرا پھوڑا ٹھیک کر سکتا ہے۔ جس کے بعد اسے دس ہزار روپے بیٹھے بٹھائے مفت میں مل جائیں گے۔ یہ سوچتے ہی وہ خوشی سے ناچ اٹھا اور اس خوشی میں وہ اپنے خریدے ہوئے مشورے بھی بھول گیا اور اس نے اپنی بیوی کو بلا کر جلدی جلدی پھل کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میں چوہدری کے پاس جا رہا ہوں تاکہ اس سے انعام دینے کا وعدہ لکھوا لوں بعد میں کہیں وہ مکر نہ جائے۔ کل صبح سویرے میں پھل لینے کے لئے روانہ ہو جاؤں گا۔

سیٹھ کے جانے کے بعد اس کی بیوی کے پیٹ میں کھلبلی مچنے لگی اور وہ کسی کو یہ بات بتانے کے لئے بے تاب ہو گئی۔ اس نے جلدی جلدی سارے کام سمیٹے اور پہلی فرصت میں جا کر اپنی پڑوسن سے سارا قصہ بیان کر دیا۔ پڑوسن نے یہ واقعہ اپنے شوہر کو بتایا۔

جب سیٹھ چوہدری کے گھر سے واپس آ رہا تھا تو راستے میں اس کا پڑوسی چوہدری کے گھر جاتے ہوئے ملا۔ پڑوسی نے کہا۔

"سیٹھ تم کہاں سے آ رہے ہوں۔"

سیٹھ نے کہا "میں چوہدری کے گھر سے آ رہا ہوں میں کل اس کا پھوڑا ٹھیک کر دوں گا۔"

پڑوسی نے کہا۔ "تم کل اس کا پھوڑا ٹھیک کرو گے میں آج ہی جا کر چھو منتر کروں گا اور اس کا پھوڑا ٹھیک ہو جائے گا۔"

"مجھے لگتا ہے تم اپنے حواس میں نہیں ہو۔"

پڑوسی نے کہا۔ "اچھا لگاؤ شرط اگر پھوڑا ٹھیک ہو جائے تو کیا دو گے۔"

سیٹھ کو یقین تھا کہ اس کا پڑوسی خواہ مخواہ کی بڑ ہانک رہا ہے چنانچہ اس نے ترنگ میں آکر کہا۔ "جو تم مانگو گے وہ دوں گا۔"

پڑوسی نے کچھ سوچ کر سیٹھ سے کہا، "ٹھیک ہے تو پھر وعدہ کرو کہ اگر چوہدری میرے علاج سے ٹھیک ہو گیا تو تمہارے گھر آکر سب سے پہلے جس چیز کو چھوؤں گا وہ چیز میری ہو جائے گی۔"

سیٹھ نے جوش میں آکر چالاک پڑوسی کی شرط مان لی۔

پڑوسی بھاگم بھاگ کنوئیں کے پاس پہنچا اور کافی دیر کی تلاش کے بعد پھل کو ڈھونڈ نکالا۔ پھل کی

چوٹ پڑتے ہی چوہدری کا پھوڑا ٹھیک ہو گیا اور سیٹھ کے پڑوسی کو دس ہزار روپے انعام مل گیا۔

ادھر سیٹھ اگلی صبح سفر پر روانہ ہونے کا منصوبہ بنا رہا تھا کہ اطلاع ملی کہ پڑوسی اپنی شرط جیت گیا ہے۔ سیٹھ یہ سن کر بے چین ہو گیا دس ہزار روپے تو ہاتھ سے نکلے ہی تھے وہ شرط بھی ہار چکا تھا۔ اب پریشانی یہ تھی کہ اگر پڑوسی نے اس کی تجوری سب سے پہلے چھو لی تو وہ کنگال ہو جائے گا اب اسے خیال آیا کہ یہ سب عقل مند نظیر کے مشوروں پر عمل نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ لیکن اب کیا ہو سکتا ہے؟ سیٹھ کو پھر مشوروں کی دکان یاد آگئی۔ وہ دوڑ کر مشوروں کی دکان پر گیا اور اس نے عقل مند نظیر کو اپنی ساری رام کہانی سنائی۔

نظیر نے سارا ماجرا سن کر کہا "سنو! جو کچھ ہوا سو ہوا۔ اب تم گھر جا کر مچان بناؤ اور مچان کے اوپر اپنی تجوری رکھ دو۔ ہاں لیکن ایک سیڑھی مچان سے لگا کر ضرور کھڑی کر دینا میں بھی ٹھیک وقت پر وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

جب لوگوں کے کانوں تک یہ شرط والی بات پہنچی تو وہ سب تماشا دیکھنے سیٹھ کے مکان کے سامنے اکٹھے ہو گئے وقت مقررہ پر پڑوسی اپنے دس بارہ دوستوں کو لے کر سیٹھ کے گھر کے احاطے میں داخل ہوا۔ اس نے ادھر ادھر جھانک کر دیکھا لیکن تجوری کہیں نظر نہیں آئی تب اس کی نگاہ مچان پر رکھی تجوری پر پڑی اور سب سے پہلے تجوزی کو چھونے کے خیال سے وہ سیڑھی کی طرف بڑھا تاکہ اوپر چڑھ سکے۔ ابھی وہ سیڑھی کو پکڑ کر اوپر چڑھنے بھی نہ پایا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی۔

"تجوری کو چھونے کی جلدی نہ کیجئے۔" پڑوسی نے مڑ کر دیکھا تو مشوروں کی دکان والا عقل مند نظیر بھیڑ کو چیر کر آگے بڑھ آیا تھا۔ اس نے کہا۔

"سیٹھ جی آپ کے پڑوسی نے سب سے پہلے سیڑھی کو چھوا ہے۔ اب سیڑھی کے مالک آپ کے پڑوسی ہیں۔ برائے مہربانی سیڑھی آپ ان کے حوالے کر دیجئے۔"

عقل مند نظیر کی بات پر پڑوسی نے احتجاج کیا۔ مگر وہاں اکٹھے سب لوگوں نے ایک آواز ہو کر کہا۔ "عقل مند نظیر کا کہنا ٹھیک ہے۔ تم نے سب سے پہلے سیڑھی کو چھوا ہے۔ شرط پوری ہو چکی ہے۔"

پڑوسی بے چارا کیا کرتا اپنا سامنہ لے کر وہاں سے چلا گیا۔ عقل مند نظیر کی دانش مندی سے سیٹھ ایک بڑے نقصان سے بچ گیا۔

سچ کہتے ہیں۔ "مشورہ ضرور کرنا چاہئے۔ اور جو اچھا مشورہ دے اسے ماننا بھی ضرور چاہئے۔ اچھے مشورے پر عمل کر کے آدمی پچھتانے سے بچ جاتا ہے۔

ننھی غزل

حفیظ الرحمن احسنؔ

محفل کو شعر و نغمہ سے آباد کیا کریں
تم سنتے ہی نہیں ہو تو ارشاد کیا کریں

آنا کہاں کا، خط بھی نہیں لکھتے یار تم
تم تو ہو بے نیاز، تمہیں یاد کیا کریں

سب کچھ ہے، ٹی وی، ریڈیو، کار اور وی سی آر
اب ہم بھلا نئی کوئی ایجاد کیا کریں

الزام ان کو دیتے ہیں اور سوچتے نہیں
لڑکے ہوں کند ذہن تو استاد کیا کریں

مانا کہ آج خوب پٹے ہم کلاس میں
خود ہیں قصور وار تو فریاد کیا کریں

پنجرے کا عیش اس کو بہت آگیا پسند
مٹھو میاں کو قید سے آزاد کیا کریں

ہر شخص، اپنے حال میں ہے مست آج کل
احسنؔ کسی کو شاد یا ناشاد کیا کریں

گلگلے

انعامی لطیفہ

○...... ایک صاحب ملٹری پولیس میں انٹرویو دینے گئے۔ کرنل صاحب نے پوچھا۔ آپ کا نام؟

جواب ملا...... ایم پی یعنی مجیب پرویز۔

کرنل صاحب نے پوچھا۔ باپ کا نام؟

انہوں نے کہا۔ ایم پی یعنی محمد پہلوان۔

اچھا تو آپ کس شہر سے تعلق رکھتے ہیں؟

انہوں نے کہا ایم پی یعنی مخدوم پور۔

آپ یہاں کس سلسلے میں میں آئے ہیں۔

انہوں نے کہا ایم پی یعنی ملٹری پولیس۔

لیکن اگر میں تمہیں نوکری نہ دوں تو؟

تو جناب پھر بھی ایم پی۔

"بھئی اس ایم پی کا مطلب کیا ہے؟

مٹی پلید ہو گی جناب۔

عبدالحفیظ شاہد مخدوم پور پہوڑاں۔

○...... اعجاز (اسلم سے) تم پاس ہو گئے؟

اسلم...... ہاں، مگر ہمارے ماسٹر صاحب فیل ہو گئے۔ وہ ابھی تک اسی کلاس کو پڑھا رہے ہیں جس کو پچھلے سال پڑھا رہے تھے۔

.... ○○ ....

○...... ایک جگہ شادی ہو رہی تھی۔ شادی والوں نے دیگ کے پاس اپنا ایک رشتہ دار بٹھا دیا تاکہ وہ مہمانوں کو حساب سے کھانا دے۔ یہ شخص اپنے رشتہ داروں کو دو بوٹیاں اور ایک آلو دیتا تھا اور ناواقف کو ایک آلو اور شوربہ۔

شادی میں شامل ایک اجنبی کھانا لینے گیا تو اس کی ایک پلیٹ میں آلو اور شوربہ ڈال دیا گیا۔ وہ

بوٹی کی امید لے کر دو مرتبہ کھانا لینے گیا لیکن ہر مرتبہ آلو اور شوربہ ہی ملتا۔ جب وہ تیسری مرتبہ کھانا لینے گیا تو ایک مرتبہ پھر شوربہ اور آلو ملا۔ اجنبی شخص بڑی معصومیت سے بولا۔ "جی کوئی ہڈی والا آلو نہیں ہے۔"

.... ○○ ....

○ ...... ایک دفعہ علی گڑھ میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ علامہ اقبال بھی تشریف فرما تھے۔ مشاعرے کے اختتام پر کالج کے چند شوخ لڑکوں نے علامہ کو پریشان کرنے کی ٹھانی اور ایک مصرعہ گھڑ کر علامہ سے گرہ لگانے کو کہا۔ مصرعہ یہ تھا۔ ؎

مچھلیاں دشت میں پیدا ہوں ہرن پانی میں

اقبال ایسے بکھیڑوں سے پرہیز ہی کرتے تھے لیکن طالب علموں کے بے حد اصرار پر ڈائس کی طرف آئے اور گرہ لگا کر شعر مکمل کر دیا۔ ؎

اشک سے دشت بھریں آہ سے سوکھیں دریا
مچھلیاں دشت میں پیدا ہوں ہرن پانی میں

.... ○○ ....

○ ...... ایک صاحب نے کسی ڈوبتے ہوئے بچے کی

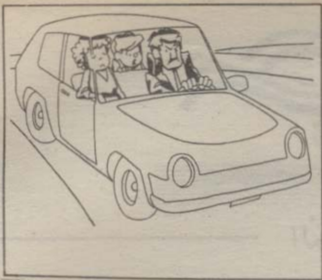

جان بچائی تو اس، کا باپ ان کے پاس پہنچا اور پوچھنے لگا "آپ نے ہی میرے لڑکے کو دریا سے نکالا تھا؟"

ان صاحب نے انکسار بھرے لہجے میں کہا۔ "جی ہاں۔ لیکن اب اس کا ذکر نہ کیجئے۔"

لڑکے کے باپ نے غصے بھرے لہجے میں کہا۔ "ذکر کیوں نہ کروں۔ لڑکے کی ٹوپی اور جوتے جو غائب ہیں۔"

(مرسلہ: اللہ داد شاد ...... تربت مکران)

.... ○○ ....

○ ...... ایک آدمی کو حکومت کی طرف سے بیکاری کا الاؤنس ملتا تھا۔ کسی نے پوچھا کہ بھئی آخر تم سدا دن بیکار پڑے کیا کرتے رہتے ہو؟ "بعض اوقات تو میں بیٹھا رہتا ہوں اور سوچتا رہتا ہوں"۔ اس نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ "اور بعض اوقات میں صرف بیٹھا رہتا ہوں"۔

.... ○○ ....

○ ...... مجسٹریٹ (ملزم سے) کہا اگر تمہارا کوئی وکیل ہے تو اسے حاضر کرو۔

ملزم ...... جناب میرا وکیل کوئی نہیں ہے کیونکہ میں

بالکل سچا واقعہ بیان کرنے والا ہوں۔

.... ○○ ....

○ ......" بہن آج میں نے کوئی چار بجے کے قریب تمہارے شوہر کو پولیس کی گاڑی میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔"

"ٹھیک دیکھا ہو گا سہیلی نے اپنی گھبراہٹ دور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "وہ آج تک پیدل نہیں چلے۔"

.... ○○ ....

○ ...... مجسٹریٹ...... کیا تم اس جھگڑے کو عدالت سے باہر نہیں نمٹا سکتے تھے۔

ملزم...... جناب ہم اسی کوشش میں مصروف تھے کہ اتنے میں پولیس نے آکر دخل اندازی شروع کر دی۔

.... ○○ ....

○ ...... استاد...... طالب علم سے ...... چیکو سلوویکیا کے متعلق جو کچھ تمہیں معلوم ہے بتاؤ۔

شاگرد ...... جناب اس کے ہجے بہت مشکل ہیں۔

.... ○○ ....

○ ...... "کیا آپ اپنے ہم پیشوں کو کچھ رعائت دیتے ہیں؟" ایک شخص نے دکان میں داخل ہو کر جوہری سے سوال کیا۔

"ہاں کیوں نہیں، ضرور رعائت دیتے ہیں فرمایئے؟"

"خوب بڑی خوشی کی بات ہے۔" گاہک نے کہا "میں چور ہوں۔"

.... ○○ ....

○ ...... "میرے شوہر تو بہن بہت ظالم ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر بگڑ جاتے ہیں کل میں نے پہلی دفعہ ان کے لئے کھانا پکایا شاید اس میں نمک زیادہ تھا۔ انہوں نے کتے کو ڈال دیا۔"

"یہ واقعی ظلم ہے۔ بے زبانوں کے ساتھ ایسا بُرا سلوک نہیں کرنا چاہئے۔"

○ ..... بچہ...... "ڈیڈی آپ نے جو گلاب کی قلم لگائی ہے، اسے ایک ہفتہ ہو گیا ہے، لیکن اب تک اس کی جڑیں نہیں نکلیں۔"

ڈیڈی...... "تمہیں کیسے پتہ چلا؟"

بچہ...... میں اسے روزانہ اکھاڑ کے جو دیکھتا ہوں۔"

.... ○○ ....

○ ..... ہوٹل کا بل ادا کرنے کے بعد رخصت ہونے والے مسافر نے اپنے سامان کا جائزہ لیا اور پھر گھبرا کر ہوٹل کے ملازم سے کہا!

"ذرا کمرہ نمبر ۱۲ میں جا کر دیکھو میں وہاں اپنی گھڑی اور عینک تو نہیں بھول آیا۔ جلدی جاؤ۔ گاڑی چھوٹنے میں صرف ۱۵ منٹ رہ گئے ہیں۔"

بارہ منٹ کے بعد نوکر دوڑتا ہوا آیا اور بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"جی جناب! دونوں چیزیں کمرے کی چھوٹی میز پر رکھی ہیں۔"

.... ○○ ....

○ ..... ایک اخبار کے ایڈیٹر نے نئے ادیب سے پوچھا۔ "کیا آپ کو ہمارا بھیجا ہوا چیک مل گیا ہے؟"

"جی ہاں! دو مرتبہ۔" ادیب نے جواب دیا۔

ایڈیٹر نے حیرت سے پوچھا "دو بار کیسے؟"

"ایک مرتبہ آپ نے بھیجا اور دوسری مرتبہ بینک والوں نے۔"

.... ○○ ....

○ ..... تانگے والا (بڑھیا سے) "بچ مائی بچ"

لیکن بڑھیا نے نہ سنا اور تانگے کے نیچے آکر زخمی ہو گئی تو پولیس والے نے چالان کر دیا۔ پولیس والے نے پوچھا کہ تم نے جان بوجھ کر ایسا کیا؟ تانگے والا چپ رہا لیکن بڑھیا بولی۔

"اس وقت تو بڑا چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ بچ مائی بچ۔ اب کیوں نہیں بولتا۔

(محمد ظفر اللہ ضیاء کمالیہ،)

نئی روشنی

سرمد ایوب

اسکول کا وقت ختم ہو چکا تھا اور میں اپنا بستہ سنبھالے اسکول کے گیٹ پر کھڑا اپنے ابو کا منتظر تھا۔ ہارن کی آواز سن کر میں نے بستہ اٹھایا اور باہر جھانکا۔ ابو گاڑی میں بیٹھے میری ہی جانب دیکھ رہے تھے۔ چوکیدار نے گیٹ کا ایک پٹ کھول دیا اور میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گاڑی میں آ بیٹھا۔

"کیسا رہا اسکول ؟" ابو نے گاڑی بڑھا کر مجھ سے پوچھا "بہت اچھا، ابو جی۔ مجھ ہوم ورک پر شاباش بھی ملی۔"

"بہت خوب۔ ایسے ہی دل لگا کر پڑھتے رہو بیٹا۔ تعلیم انسان کے لئے بہت ضروری ہے۔ تعلیم کے بنا انسان مکمل نہیں ہوتا۔"

میں ان کی باتوں پر سر ہلاتا رہا۔ گاڑی کو گھر کے بجائے کسی اور جانب بڑھتے دیکھ کر میں نے پوچھا،

"کہاں لے جا رہے ہیں ابو ؟"

تھوڑی دیر کے بعد گاڑی ایک ورک شاپ نما جگہ آکر رک گئی۔ وہاں کئی نئی اور پرانی ٹوٹی پھوٹی گاڑیاں کھڑی تھیں اور میلے کچیلے کپڑے پہنے کئی لڑکے اور بچے ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ ابو تو کسی مستری سے باتیں کرنے میں مصروف ہوگئے البتہ میں گاڑی ہی میں بیٹھا رہا۔ وہاں قریب ہی ایک نو عمر لڑکا کسی کار کے ٹائر کے پیچ کس رہا تھا۔ شکل سے بھولا بھالا سا لگ رہا تھا۔ میرا بہت جی چاہا کہ اس سے بات کروں۔ میں نے دروازہ کھولا اور آہستگی سے اس کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے دیکھ کر بھی وہ کام ہی کرتا رہا، کچھ بولا نہیں۔ میں اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے میں ایک خاص بات تھی۔ وہ یہ کہ اس کے ایک کان کی لو کٹی ہوئی تھی۔

"تمہارا کیا نام ہے ؟" میں نے پوچھا

"جی بالا کہتے ہیں مجھے سارے۔" اس نے معصومیت سے کہا۔

"کون سے اسکول میں پڑھتے ہو؟"

"اسکول ؟ اسکول تو نہیں جاتا میں جی۔ وہاں تو بڑے لڑکے ہی پڑھ سکتے ہیں ناں جی۔"

"ارے میں بھی تو اسکول میں پڑھتا ہوں، اور تمہارے ہی جتنا ہوں۔" میں نے کہا۔

"آپ اسکول میں پڑھتے ہیں؟ واہ جی، بڑی قسمت ہے آپ کی۔"

تم بھی پڑھا کرو ناں۔ بڑا مزا آتا ہے وہاں۔ پڑھائی بھی ہوتی ہے اور کھیل بھی۔"

"کھیل بھی ہوتا ہے؟" اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ "میں تو یہاں کام کرتا ہوں ناں استاد جی کے لئے۔ اس کے علاوہ اور تو کچھ بھی نہیں کرتا۔ شام کو کبھی کبھی بنٹے کھیل لیتے ہیں ہم سب۔ اس میں بھی ہار جاتا ہوں۔ چھوٹا ہوں ناں جی باقی لڑکوں سے۔"

"تو یہاں تمہارے ابو یا استاد جی تمہیں نہیں پڑھاتے کیا؟"

"توبہ کریں جی۔ استاد جی نے سن لیا تو بہت ماریں گے۔ وہ تو کہتے ہیں کہ ہم سب کام چور ہیں۔ کسی کام کے نہیں ہیں۔ یہ کام ٹھیک سے نہیں کرتے تو پڑھیں گے کیا خاک۔"

اس بات پر مجھے غصہ آگیا۔

"میں ابو سے شکایت کروں گا تمہارے استاد جی کی۔ وہ تمہیں مارتے بھی ہیں اور پڑھنے بھی نہیں دیتے۔ یہ تو بڑا ظلم ہے۔"

اس بات پر بالا گھبرا گیا۔ "نہیں نہیں جی۔ ایسا نہ کریں۔ آپ تو چلے جائیں گے مگر استاد جی

مجھے نہیں چھوڑیں گے۔ ایک بار پہلے بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ بہت مار پڑی تھی مجھے اور ایک اور لڑکے کو بھی۔ میرا کان بھی کٹ گیا تھا جی۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا، "اگر میں تمہیں پڑھایا کروں تو کیسا؟"

"آپ مجھے کیسے پڑھائیں گے جی۔ آپ تو خود پڑھتے ہیں اور پھر وہ استاد.........."

"تم فکر نہ کرو۔ میں تمہیں آکر پڑھا دیا کروں گا۔ تم پاس کے کسی پارک میں آجایا کرنا۔"

"جی قریب ایک پارک تو ہے۔ وہاں کبھی کبھی میں جھولے لینے جاتا ہوں۔ وہی جی وہ بڑے سے سفید گیٹ والا جس کی دیواریں لال سی ہیں۔"

میں بھی اس پارک میں ایک دو بار امی کے ساتھ گیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ میں وہاں کتابیں لے آؤں گا۔ پھر ہم مل کر پڑھا کریں گے۔ تم کام سے کب فارغ ہوتے ہو؟"

"جی شام کو پانچ بجے میں تھوڑی دیر کے لئے گھر جاتا ہوں، امی کو دیکھنے کے لئے۔ میرے ابا تو بہت پہلے فوت ہو گئے تھے۔ میں یہاں کام کرتا ہوں اور امی بھی ایک گھر میں کام کرتی ہیں.........."

میں نے اس سے وقت اور جگہ مقرر کرلی ۔ اسی لمحے ابو کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ انہوں نے گاڑی کا کام کروالیا تھا۔ میں جلدی سے دوڑ کر ان کے پاس آگیا۔

"کیا کر رہے تھے؟ اس لڑکے سے باتیں کر رہے تھے کیا؟"

نہیں ابو، ویسے ہی دیکھ رہا تھا کہ وہ کام کیسے کرتا ہے۔"

"اچھا اچھا۔ اب چلو۔ کام ہو گیا ہے۔"

ابو اور میں گھر آگئے۔ میرے ذہن میں اسی لڑکے کا خیال بار بار آرہا تھا۔ میں نے ارادہ کرلیا تھا کہ اسے ضرور پڑھاؤں گا۔ اگلے روز شام کے وقت سائیکل لے کر باہر نکلا۔ روز شام کو میں سائیکل چلاتا تھا لیکن دور نہیں جاتا تھا، البتہ اس بار میرا دل کچھ زیادہ ہی زور سے دھڑک رہا تھا، کیوں کہ میں نے کبھی چوری چھپے کوئی کام نہیں کیا تھا۔

پارک میں داخل ہو کر میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ لڑکے لڑکیاں کھیل کود میں مصروف تھے۔ بلا وہاں موجود نہیں تھا۔ میں نے سائیکل کھڑی کر دی اور اس کا قریب ہی بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ دس پندرہ منٹ بعد وہ مجھے نظر آیا، انہی میلے کپڑوں میں ملبوس جن میں وہ مجھے ورکشاپ میں کام کرتا دکھائی دیا تھا۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ میرے قریب آکر وہ ہاتھ ملانے کے بعد بیٹھ گیا۔ ہم نے باتیں بھی

کیں اور میں نے اسے اے بی سی اور الف بے پے سے پڑھانا بھی شروع کیا۔ بالے نے بہت دلچسپی سے اسباق کو پڑھا اور جو پنسل اور کاپی میں لے کر آیا تھا وہ تو اس نے اپنے ہی پاس رکھ لیں۔

اسی طرح میں روز آتا اور اسے کچھ نہ کچھ پڑھا دیتا۔ پھر ہم مل کر کھیلتے۔ اس کے پڑھنے کا شوق اور لگن روز بروز بڑھتا گیا۔

ایک دن وہ نہ آیا۔ میں نے اس کا بہت انتظار کیا لیکن بے کار۔ سوچا کہ شاید کسی کام یا مجبوری نے اسے روک لیا ہو گا۔ اگلے دن پھر جب میں پارک میں گیا تو اس کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ تین چار دن مزید جب وہ نہیں آیا تو مجھے بڑی فکر ہوئی۔ میں ورکشاپ کا پتا جانتا تھا۔ جو پارک سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ وہاں جاکر اس کا پتہ کیا جائے۔ تو ایک دن میں شام کو چار بجے کے قریب اپنی سائیکل پر سوار ہو کر ورکشاپ کی جانب بڑھ گیا۔ وہاں پہنچ کر مجھے بالا ایک گاڑی کو کپڑے سے صاف کرتا ہوا نظر آگیا۔ میں نے سائیکل کھڑی کی اور اس کے پاس چلا گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر بُری طرح چونکا۔

"آپ یہاں؟ آپ فوراً چلے جایئے۔ اگر استاد جی آگئے تو شامت آجائے گی۔"

وہ بے حد گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔

"پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے آنا کیوں بند کر دیا ہے۔"

"جی وہ آپ کی دی ہوئی کاپی اور پنسل استاد جی نے دیکھ لی تھی۔ انہوں نے مجھے بہت مارا۔"

میں نے غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر واقعی ہلکے ہلکے زخموں کے نشان موجود تھے۔

"وہ مجھے اب کہیں نہیں جانے دیتے۔ آپ چلے جائیں ورنہ مجھے پھر مار پڑے گی۔ میں نے انہیں آپ کا نام بھی نہیں بتایا۔ بس آپ جائیں جی۔"

میں خاموشی سے سائیکل سنبھال کر گھر آگیا۔ مجھے اس واقعہ سے بہت صدمہ پہنچا۔ میری بالے سے اچھی خاصی دوستی بھی ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے بعد مجھے اس سے ملنے کی کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ ابو سے بھی میں نے ذکر نہ کیا کہ کہیں الٹا مجھ پر ہی نہ برسیں۔

بہت دن گزر گئے۔ میرے ذہن کے کسی کونے میں بالا یاد بن کر رہ گیا۔ وقت گزرتا گیا اور میں پڑھ لکھ کر حکومت کے ایک ادارے میں اچھی سی پوسٹ پر فائز ہو گیا۔ نوجوانی اور بے فکری کے دن تھے۔ کام کرتا تھا اور فارغ ہو کر گھر آجاتا تھا جہاں سے کبھی یا تو دوستوں کے ساتھ باہر نکل گیا یا کلب وغیرہ

چلا گیا۔

ایک شام کو میں اور میرے دو دوست کلب سے لوٹ رہے تھے کہ موٹر کے انجن میں سے کچھ عجیب سی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے اس خیال سے کہ کہیں موٹر راستے میں نہ رک جائے ایک مستری کی دکان دیکھ کر روک لی۔ وہاں بہت سی گاڑیاں پہلے سے ٹھیک ہونے کے لئے کھڑی تھیں۔ ہم سب باہر نکلے۔ ایک لڑکا ہماری طرف لپکا۔

"جی باؤ جی، فرماؤ۔"

"یار ذرا اس گاڑی کو ٹھیک کرانا ہے۔ تمہارے کوئی استاد جی موجود ہیں؟"

"جی ہیں جی۔ ابھی بلاتا ہوں۔"

وہ لڑکا لوٹ گیا اور گاڑیوں کے درمیان سے ہوتا ہوا کہیں غائب ہو گیا۔ چند منٹ گزرنے کے بعد ایک نوجوان مستری ہماری طرف بڑھتا چلا آیا۔ اس کے ساتھ وہ لڑکا بھی تھا جسے میں نے بلانے کے لئے بھیجا تھا۔

"جی صاحب فرمائیے۔" اس نے بڑے شائستہ لہجے میں کہا۔

"گاڑی کا انجن کچھ عجیب طرح بول رہا ہے۔ ذرا دیکھ لو۔"

"ابھی لیجئے۔ ذرا بونٹ کھول دیں۔"

میں نے گاڑی کا بونٹ کھول دیا اور وہ مستری انجن پر جھک گیا۔ پہلے تو اس کے لب و لہجے نے مجھے حیرت میں ڈال رکھا تھا، اب اس کے چہرے کو دیکھا تو محسوس ہوا کہ ایک خاص بات اس کے چہرے کو شناسا بنا رہی ہے۔

وہ مستری کچھ دیکھنے کے بعد میری جانب چہرہ کر کے بولا،

"کچھ خاص خرابی نہیں ہے جناب۔ ابھی ٹھیک کیئے دیتا ہوں۔" پھر اس نے اپنے ساتھ کھڑے لڑکے کو کوئی اوزار لانے کو کہا۔ اسی لمحے مجھے کچھ یاد سا آیا۔ میں نے اپنے شک کو دور کرنے کی غرض سے اس کے کٹے ہوئے کان پر ایک اور نگاہ ڈالی اور پھر بولا،

"تمہارا نام بالا تو نہیں؟"

"جی .... پر آپ کو کیسے معلوم پڑا؟"

"اوہ .... یہ تم ہو۔ مجھے یقین نہیں آرہا۔ ارے میں وہی ہوں جو تمہیں بچپن میں پارک میں پڑھایا کرتا تھا۔ کیا بھول گئے؟"

بالے کے چہرے پر حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات پھیل گئے۔ وہ آگے بڑھا اور بڑی گرم

جوشی سے میرے ساتھ مصافحہ کر کے بولا،

"باؤ جی، آپ نے ہی تو میری زندگی بدلی ہے۔ میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ جب مجھے استاد جی سے مار پڑی تھی تو میں بہت مایوس ہوا تھا لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری جناب۔ میں چوری چھپے پڑھتا رہا۔ جب کچھ بڑا ہوا اور تھوڑی عقل آئی تو باقاعدہ ایک مولوی صاحب سے بھی پڑھتا رہا۔ مسجد جا جا کر ان سے درس لیتا رہا۔ اب یہ ہے کہ میں اچھی طرح بول، لکھ اور پڑھ سکتا ہوں۔ میں آپ سے بے حد متاثر تھا۔ بس اسی لگن نے مجھے آگے بڑھنے کا راستہ دکھایا۔"

"یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے بالے۔ تو اب یہ ورکشاپ اور یہ سب ....؟"

"جی بس اللہ تعالیٰ کی مہربانیاں ہیں سب۔ استاد جی نے اپنی ورکشاپ بیچ دی تو میں نے ادھر کام شروع کیا۔ اللہ نے بڑی برکت دی ہے۔ تعلیم کی وجہ سے اخلاق پیدا ہوا اور اخلاق کی وجہ سے گاہک کھنچے چلے آئے۔ میں ہی یہاں کا سارا کام سنبھالتا ہوں لیکن آپ کو ایک بات اور بتا دوں۔ یہاں جتنے لڑکے کام کرتے ہیں شام کو کام کے بعد مجھ سے پڑھ کر گھر جاتے ہیں۔ میں سب کو پڑھاتا ہوں اس طرح میں بھی پڑھ لیتا ہوں، کام کے بعد نئی روشنی اسکولوں میں بھی میں بچوں کو پڑھنے کے لئے بھیجتا ہوں۔ لیکن یہ روشنی آپ ہی نے دکھائی ہوئی ہے۔"

میں ہکا بکا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ سب ہو چکا ہے۔ وہ کہتا رہا،

"جناب میں تو خود اس تجربے سے گزرا ہوں۔ مستریوں کے ساتھ کام کر کے میں نے کیا بن جانا تھا۔ انہی کی طرح کی گندی زبان میں بات کرتا۔ معاشرے میں عزت بھی نہ ہوتی۔ شرافت کا سبق نہ آتا۔ اچھائی کی تربیت نہ ملتی۔ تعلیم تو جی انسان کو واقعی انسان بنا دیتی ہے۔ آپ کو یہاں کا ماحول بہت اچھا لگے گا۔ صرف اس لئے کہ یہاں پر موجود تمام بچے پڑھتے ہیں۔ نجم سے پوچھ لیں بے شک۔ لڑکا اوزار لے کر آچکا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ میں نے اپنے دوستوں کی طرف دیکھا۔ وہ بے حد متاثر نظر آرہے تھے۔ بالا اوزار لے کر گاڑی پر جھک گیا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو بالے۔ ہمارے ملک میں نہ جانے کتنے بچے پڑھائی کی سہولتیں ہونے کے باوجود ماحول کی زیادتیوں کا شکار ہو کر تباہ اور ضائع ہو رہے ہیں۔ تم ان کے لئے روشنی کی ایک کرن ہو۔ میں تمہارے جذبے اور ہمت کو سلام کرتا ہوں۔"

گاڑی ٹھیک ہو گئی اور میں وہاں سے رخصت ہو کر آگیا۔ لیکن میرے دل و دماغ میں ایک منزل اور ایک محاذ قائم ہو چکا تھا جس کو پانے اور جس پر لڑنے کے لئے مجھے روشنی مل گئی تھی۔

کون کیا کر رہا ہے

کوئز کہانی

نئے دشمن

اسامہ بن سلیم

قسط نمبر ۴

گزشتہ ماہ ہم آپ کے لئے کوئز کہانی پیش نہ کر سکے۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ رسالہ پریس میں جانے تک بہت کم جوابات موصول ہوئے تھے اور ہمیں یہ گوارانہ تھا کہ ساتھیوں کی بہت بڑی تعداد اس مقابلے میں شرکت سے محروم رہ جائے۔ کوئز کہانی میں ملک بھر سے ہزاروں ساتھیوں کی شرکت ان کی بھی بھرپور دلچسپی کو ظاہر کرتی ہے، جس پر ہم اپنے ساتھیوں کے ممنون ہیں۔

لیجئے کوئز کہانی کا سلسلہ نمبر ۴ حاضر ہے۔ نئے شرکاء کے لئے ایک بار پھر بتائے دیتے ہیں کہ اس مہماتی کہانی میں جو چار بہن بھائیوں کے گرد گھومتی ہے، جا بجا معلومات عامہ کی دس کی غلطیاں جان بوجھ کر چھوڑ دی گئی ہیں۔ آپ نہ صرف ان غلطیوں کی نشاندھی کریں گے بلکہ انہیں درست بھی کریں گے۔ علیحدہ صاف کاغذ پر جوابات تحریر کیجئے اور ماہ رواں کی ۱۰ تاریخ تک ہمیں ضرور بھجوا دیجئے۔ کاغذ پر آپ کا نام اور پتہ ضرور ہونا چاہئے اور اس مقابلے میں شرکت کا وہ کوپن بھی جو اس شمارے کے آخری صفحات میں موجود ہے۔ تین ساتھی قرعہ اندازی کے بعد انعام کے حق دار ہوں گے۔ لیجئے کہانی پڑھئے۔

دانش، ذیشان، حسن اور انعم نے وڈیو والوں کو گرفتار کروانے کا جو کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ اس کی دھوم پورے پلازہ میں مچ گئی تھی۔ پلازہ کے اکثر بچے، خواتین اور اکثر بزرگ انہیں رشک بھری نظروں

سے دیکھنے لگے تھے۔ ہر طرف ان بچوں کی ذہانت کے قصے دہرائے جارہے تھے۔

ایک گروپ البتہ ایسے لڑکوں کا پیدا ہو چکا تھا جنہیں ان چاروں کی نیک نامی اور ان کی شہرت ایک آنکھ نہیں بھائی۔ ایسے لڑکے عموماً ہر علاقے میں پائے جاتے ہیں جو نہ تو خود کوئی ڈھنگ کا کام کر سکتے ہیں اور نہ ہی کسی کو اچھا کام کرتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ کاشف موٹو، اسلم چنو، رئیس ٹنڈا، اور اسرار لمبو، یہ چاروں شرارتی لڑکوں کا ٹولہ تھا۔ بہ ظاہر یہ چاروں ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے، اپنی جسمانی ساخت، قدو قامت اور حلیوں میں ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود یہ چاروں بلا کے فطین تھے۔ ان کے دماغ تخریب کاری کے لئے انتہائی زرخیز اور موزوں تھے۔

یوں بھی یہ چاروں دانش، ذیشان اور حسن وغیرہ سے بڑے تھے مگر نہ جانے کیوں یہ بچے ان کی نظروں میں کھٹکنے لگے تھے۔ بگڑے ہوئے چاروں لڑکے پلازہ میں "چلٹم گروپ" کے نام سے مشہور تھے۔ "چلٹم" دراصل چار الفاظ کا مخفف تھا۔ چھوٹو کا "چ" لمبو کا "ل" ٹنڈے کا "ٹ" اور موٹو کا "م" اس طرح پلازہ ہی کے کچھ شریر لڑکوں نے ان چاروں کے ناموں سے ایک ایک حرف چن کر "چلٹم" نام بنالیا تھا۔ یہ چاروں اکثر ساتھ ہی ہوتے اور پورا پلازہ انہیں "چلٹم گروپ" کے نام سے جانتا تھا۔ بلکہ اب تو اس نام کو خود ان چاروں نے بھی ذہنی طور پر قبول کر لیا تھا۔ اور اپنے آپ کو چلٹم گروپ کہتے ہوئے ان کا سینہ فخر سے تن سا جاتا تھا۔

ایک روز کاشف موٹو نے چلٹم گروپ کے بقیہ ارکان سے کہا، "کیوں نہ ان چاروں سراغ رسانوں کو تنگ کیا جائے۔ ؟" "فنٹاسٹک آئیڈیا۔" اسرار لمبو نے جواب میں کہا۔ تھوڑی ہی دیر میں چلٹم گروپ کے چاروں ارکان، دانش، ذیشان، حسن اور انعم کو پریشان کرنے کے لئے نئی ترکیبیں سوچنے لگ گئے۔

دانش، ذیشان، حسن اور انعم کی ذہانت اور شجاعت کے قصے گھر گھر پھیل گئے تھے مگر خود ان کے گھر کی کیفیت بالکل مختلف تھی۔ امی ابو کو ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ بچوں نے اب تک جن لوگوں کو گرفتار کروایا ہے کہیں وہ جان کے دشمن ہی نہ ہو جائیں۔ گھر میں اور گھر سے باہر ان کے معاملات پر کڑی نظر رکھی جانے لگی تھی۔ اسکول بھجواتے ہوئے اور واپسی پر بھی خیال رکھا جاتا کہ کہیں کوئی انہیں نقصان نہ پہنچا سکے۔

دانش، ذیشان اور حسن بھی اس بات سے پوری طرح آگاہ تھے کہ انہوں نے کئی طرح کے خطرات مول لے لئے ہیں اور یہ کہ انہیں بہت زیادہ محتاط رہنا چاہئے۔ پلازہ کی چھت پر بنی ہوئی پانی کی ٹنکی کے نیچے، اپنے مورچے میں بیٹھے ہوئے تینوں بھائیوں نے بڑی سنجیدگی سے اس نکتے پر غور شروع کیا کہ، ہمیں

اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھنا چاہئے یا بند کر دینا چاہئے، ؟ دانش کا خیال تھا کہ اب ان بکھیڑوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے، یوں بھی امتحان سر پہ ہیں اور یہ سارا وقت امتحان کی تیاری میں گزرنا چاہئے۔ ذیشان کا کہنا یہ تھا کہ امتحان کے دنوں میں ہم صرف پڑھیں گے مگر امتحان کے بعد ایک بار پھر اپنی سرگرمیاں شروع کر دیں گے۔ حسن نے ذیشان کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ، ہم لوگ کوئی غلط کام تو کر نہیں رہے۔ برے لوگوں اور ملک دشمنوں کو نقصان پہنچانا تو اچھا کام ہے اور ہمیں ہر اچھا کام ضرور کرنا چاہئے۔

اس مسئلے پر کافی بحث کے بعد بالآخر یہ طے پا گیا کہ "برائی کے خلاف جہاد جاری رہے گا"۔ یہ جہاد بچے اپنی عمر، علم اور عقل کی سطح پر جس طرح بھی لڑ سکتے ہیں ضرور لڑیں گے، اور اگر خود کچھ نہ کر سکے تو کم از کم اچھی قوتوں کے مددگار ضرور بنیں گے۔

پانی کی ٹنکی تلے ہونے والے اس سہ رکنی اجلاس میں جس میں انعم شامل نہیں تھی، یہ بھی طے پایا کہ ان بچوں کی اپنی ایک تنظیم ہوگی جس کا نام "گرین گارڈز" ہوگا۔ اس نام میں لفظ گرین ملک اور مذہب کی علامت تھا جبکہ اس تنظیم کے ارکان اس علامت کے محافظ (گارڈز) تھے۔

اپنی تنظیم کے نئے نام اور مقاصد طے پانے کے بعد یہ تینوں بہت مطمئن اور مسرور تھے۔ سب کچھ طے پا جانے کے بعد انعم کو بھی باخبر کر دیا گیا اور سختی سے یہ ہدایت بھی دے دی گئی کہ کسی بھی طرح امی اور ابو کو "گرین گارڈز" کے قیام کا پتہ نہ چلے۔

گرین گارڈز تو بن چکی تھی مگر ساتھ ہی یہ بھی طے پا چکا تھا کہ جب تک امتحان ختم نہیں ہو جاتے ہر طرح کی غیر نصابی سرگرمیوں پر پابندی رہے گی۔

دانش، ذیشان حسن اور انعم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ اور ان کے روز و شب کتابوں میں گزرنے لگے۔

چاروں بہن بھائی اسکول کے اچھے طالب علم تھے، دانش نویں میں تھا اور اس کا پسندیدہ مضمون فزکس تھا۔ خاص طور پر فزکس کا نظریہ ارتقاء دانش کا پسندیدہ موضوع تھا۔ نظریۂ اضافت او آرشمیدس کا اصول حرکت تو ذیشان کو زبانی یاد تھے۔ اسی طرح ذیشان کا پسندیدہ مضمون اردو تھا۔ اردو ادب میں مومن خان مومن کے افسانے حسن کو بے حد پسند تھے۔ انعم ابھی پہلی کلاس میں تھی، اس کی پسند کیا اور ناپسند کیا، بس وہ تو اسکول کا کام ختم کرنے کے بعد امی سے مشہور شخصیات کے قصے سنا کرتی تھی۔ آج بھی امی نے انعم کو مشہور امریکی آرٹسٹ نائٹ انگیل کی زندگی کے حالات بتائے تھے جنہیں سن کر وہ بے حد متاثر ہوئی۔

انعم نے اپنی ڈرائنگ بک میں جن مشہور شخصیات کے اسکیچز بڑی خوبصورتی سے بنائے تھے۔

ان میں مشہور موسیقار ایڈیسن، دوسری جنگ عظیم کا ہیرو نیرو اور اندھی گونگی اور بہری لڑکی گولڈا میئر کے اسکیچز خاص طور پر قابل ذکر تھے۔

نصاب کے مضامین میں سب کی پسند اپنی اپنی تھی سب کے ہیرو الگ الگ تھے۔ مگر جو بات ان سب میں مشترک تھی، وہ ان سب کی ذہانت اور لگن تھی جس کے باعث یہ چاروں اسکول سے لے کر اپنے گھر اور پلازہ تک ہر جگہ یکساں طور پر پسند کئے جاتے۔ گو امتحان سر پہ تھے مگر پھر بھی ان سب کو شام کو کچھ وقت کھیلنے کی اجازت مل جایا کرتی۔ انجم صاحب کا خیال تھا کہ ذہن کو ترو تازہ رکھنے کے لئے پڑھنے کے ساتھ ساتھ کچھ وقت کھیلنا بھی ضروری ہے، خواہ امتحان کے دن ہی کیوں نہ ہوں۔

شام کے وقت پلازہ کے وسیع لان پر یہ چاروں بہن بھائی اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر کرکٹ کھیلا کرتے۔ کرکٹ ان چاروں کا پسندیدہ کھیل تھا۔ کرکٹ کے حوالے سے جیف ہنٹ ان سب کا پسندیدہ کھلاڑی تھا۔

گرین گارڈز کے قیام سے لے کر امتحانوں کے اختتام تک کوئی غیر معمولی بات نہ ہوئی، نہ ہی کوئی ایسا واقعہ پیش آیا جو ان ننھے جاسوسوں کے لئے تشویش کا باعث بنتا۔

اس عرصے میں ذیشان میں ایک تبدیلی یہ آگئی تھی کہ وہ اخبار کا مطالعہ کرتے ہوئے صرف جرائم کی خبروں کو غور سے دیکھا کرتا بلکہ اس نے تو اپنی نوٹ بک میں جرائم کی خبروں کا باقائدہ اندراج بھی شروع کر دیا تھا۔

خبروں کے معاملے میں ذیشان حیران کن حد تک اندازے لگاتا جو اکثر درست ثابت ہوتے۔ اکثر دو مختلف اخبارات میں چھپنے والی خبروں کو ذیشان ایک ہی خبر کے دو حصے قرار دیتا اور کہتا کہ "دیکھ لینا آخر کار دو مختلف علاقوں میں ہونے والی وار داتیں ایک ہی گروپ کی وار دات ثابت ہوں گی۔" اور واقعی ایسا ہو بھی جاتا۔

ذیشان جرم و تفتیش کی کہانیاں اور خبریں خصوصی توجہ سے پڑھتا بلکہ اب تو اس نے اس طرز کا ایک مضمون بھی لکھ ڈالا تھا۔ یہ مضمون مشہور مسلمان گوریلا لیڈر امام شامل سے متعلق تھا جنھوں نے امریکہ میں گوریلا جنگ کے ذریعہ آزادی کی جدوجہد کی تھی۔

خدا خدا کر کے ان سب کے امتحان ختم ہوئے۔ سب نے سکھ کا سانس لیا۔ امتحان ختم ہوئے گویا سر سے ایک پہاڑ اتر گیا۔ سب کے پرچے اچھے ہوئے تھے اس لئے سبھی خوش تھے، سوائے حسن کے جو وقت کی کمی کی وجہ سے تاریخ کے دو سوالوں۔ کے جواب نہیں لکھ پایا تھا۔ چالیس نمبر کے دو سوال رہ جانے پر حسن کو بہت افسوس تھا۔

ایک روز گھر میں بیٹھے بیٹھے دانش کے منہ سے یونہی نکلا کہ " آؤ اپنے مورچے کی طرف چلتے ہیں۔ مورچے کی طرف گئے ہوئے انہیں ایک عرصہ ہو گیا تھا اور اب امتحان کے بعد اس مورچے کی خبر لینا ضروری ہو گیا تھا، جو انہوں نے پلازہ کی چھت پر بنی ہوئی پانی کی ٹنکی کے نیچے بنا رکھا تھا۔

چھٹی کے دن ناشتہ کرنے کے بعد دانش، ذیشان، حسن اور انعم سیڑھیاں چڑھتے ہوئے جونہی چھت پر پہنچے، سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور قدم وہیں پر رک گئے۔

"یہ کیا" !! سب کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ مورچے میں ڈلے ہوئے گدے اور تکئے کو نوچ نوچ کر پوری چھت پر پھینک دیا گیا تھا۔ گدے کی روئی جابجا اڑ رہی تھی۔ چائے کے کپ ریزہ ریزہ ہو چکے تھے۔ چند کھلونے دوربینیں، تھرماس، گلاس، سبھی کچھ ٹوٹا ہوا تھا اور پانی کی ٹنکی پر بڑا بڑا سا لکھا ہوا تھا......
"ہم تمہاری موت ہیں"۔

پھر کیا ہوا۔؟ تخریب کاری کا یہ واقعہ کیوں پیش آیا۔؟ نئے دشمن کون تھے۔؟

نئی صورت حال کا مقابلہ ان چار ننھے جاسوسوں نے کس طرح کیا۔؟ یہ سب کچھ آپ آئندہ ماہ کوئیز کہانی میں ضرور پڑھئے۔

کوئیز کہانی نمبر ۳ کے درست جوابات

---

(۱) ایرو فلوٹ امریکہ کی نہیں، روس کی ایئر لائن ہے۔ امریکن ایئر لائن کا نام "پین امریکن" ہے۔

(۲) بیجنگ جاپان کا نہیں چین کا شہر ہے۔

(۳) دریائے ایمزان برازیل (براعظم امریکہ) میں ہے۔

(۴) نانگا پربت کی چوٹی پاکستان میں ہے۔

(۵) نیاگرا آبشار کینیڈا اور امریکہ کی سرحد پر واقع ہے۔

(۶) مشہور عالمی ایکسپو Expo جاپان میں ہوتی ہے۔ اب دنیا کے مختلف ملکوں میں بھی بڑی نمائشوں کے لئے یہ نام استعمال ہونے لگا ہے۔

(۷) لیو شاؤچی جاپان کے نہیں چین کے سابق صدر ہیں۔

(۸) سعودی عرب کی کرنسی درہم نہیں ریال ہے۔

(۹) امریکی کرنسی پونڈ نہیں ڈالر ہے۔

(۱۰) لیفٹننٹ کمانڈر آرمی میں نہیں نیوی میں ہوتا ہے۔

درست جوابات بھیجنے والے ساتھیوں کے نام

(۱) راشد اشرف، حیدر آباد۔ (۲) معاذ احمد شمسی، نارتھ کراچی۔ (۳) موسیٰ زبیری، کراچی۔ (۴) نازیہ سید نازی، بھکر۔ (۵) خرم شیرازی، بھکر۔ (۶) راحیل بن محمد یحییٰ، حیدر آباد۔ (۷) علی فاروق، رحیم یار خان۔ (۸) سید نعیم الحق، کراچی۔ (۹) فطین مبارک، کراچی۔ (۱۰) خالد محمود ناصر، کراچی۔ (۱۱) محمد علی، کراچی۔ (۱۲) علی حسن، کراچی۔ (۱۳) طہ ارشاد، کراچی۔ (۱۴) نازش اشتیاق، کراچی۔ (۱۵) صفیہ علی بخاری، حیدر آباد۔ (۱۶) فرید خان، کوئٹہ۔

قرعہ اندازی کے ذریعے انعام پانے والے ساتھیوں کے نام

اول :۔ فرید خان، کوئٹہ۔ دوم:۔ سید نعیم الحق، کراچی۔ سوم:۔ محمد علی، کراچی۔

ایک غلطی کرنے والے ساتھیوں کے نام

(۱) موعود عالم مزاری، رحیم یار خان۔ (۲) وقار عظیم لاہور۔ (۳) مظہر مغل، راولپنڈی۔ (۴) عظمیٰ خالد اسلام آباد۔ (۵) ذوالفقار حیدر راجپوت، سنگھڑ۔ (۶) یاسر رزاق، صادق آباد۔ (۷) سید محمد اقبال، کراچی۔ (۸) فواد حامد، کراچی۔ (۹) سیدہ شوکت، کراچی۔ (۱۰) عنبرین گلزار علی، کراچی۔ (۱۱) سیدہ ماجدہ خاتون نقوی، کراچی۔ (۱۲) محمد انوار، کراچی۔ (۱۳) محمد ریاض، کراچی۔ (۱۴) محمد علی سفیر، کراچی۔ (۱۵) ارجمند جبیں، کراچی۔ (۱۶) محمد فیصل یونس، کراچی۔ (۱) کرن نسیم، کراچی۔ (۱۸) عاطف رضا، کراچی۔ (۱۹) منصور عظیم، کراچی۔ (۲۰) نوشین صدیقی کراچی۔ (۲۱) محمد عظیم انجم، سبی۔ (۲۲) ثمینہ شمس، کراچی۔ (۲۳) سائرہ کنول ثنا، کوئٹہ کینٹ۔ (۲۴) عفت النساء، کراچی۔

اسے پلو سے باندھ لیجیے

اپنی تحریر بھجواتے ہوئے یا ہمیں خط لکھتے ہوئے اپنا پتہ لفافے کی پشت پر لکھنے کو کافی نہ سمجھئے۔ اپنے ہر خط اور اپنی ہر تحریر کے پیچھے اپنا نام اور مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

ادارہ آنکھ مچولی

پرانی کہانی، نئی خبر

عظیم مغل ...... کنری

پہلے پرانی کہانی

سخت سردیوں کے موسم میں، ایک سادہ لوح دیہاتی کہیں جارہا تھا۔ چلتے چلتے راہ میں اسے ایک سانپ نظر آیا جو سخت سردی اور برف باری کے باعث ادھ موا پڑا ہوا تھا۔

دیہاتی کو سانپ پر بہت ترس آیا۔ اس نے فوراً سانپ کو اٹھایا اور گھر لے آیا۔ گھر آکر دیہاتی نے سانپ کو آگ کے قریب رکھا تاکہ اس کی سردی ختم ہوجائے۔ پھر اس نے ایک طشتری میں کچھ دودھ ڈال کر سانپ کے سامنے رکھ دیا تاکہ سانپ دودھ پی لے اور اس کی زندگی بچ جائے۔ دیہاتی کی مسلسل کوششوں سے سانپ کو نئی زندگی مل گئی۔ سانپ

کے جسم میں جیسے ہی زندگی کی حرارت دوڑی اس نے فوراً دیہاتی کو ڈس لیا۔ سانپ کے ڈستے ہی دیہاتی بیہوش ہوکر گرا اور وہیں پہ دم توڑ دیا۔

اب نئی خبر

میرپور بٹھورو سندھ کے ایک قصبے ہارن جاگیر کی ایک مسجد میں ایک سانپ کہیں سے آگیا۔ کچھ لوگوں نے آگے بڑھ کر سانپ کو مارنا چاہا، مگر مولوی صاحب نے لوگوں کو یہ کہہ کہ سانپ کو مارنے سے منع کر دیا کہ مسجد میں سانپ کو مارنا گناہ ہے۔ مولوی صاحب نے کسی متوقع کرامت یا شاید عقیدے کی قوت کی بنیاد پر سانپ کو ہاتھ سے پکڑ کر مسجد سے باہر پھینکنا چاہا۔ مولوی صاحب نے سانپ کو جونہی ہاتھوں میں پکڑا، سانپ نے مولوی صاحب کو ڈس لیا۔ یوں مولوی صاحب اللہ کو پیارے ہوگئے۔ یہ خبر گزشتہ دنوں مشہور انگریزی روزنامے "دی نیوز" نے شائع کی۔ مولوی صاحب مرحوم کا نام محمد اسحاق بتایا گیا ہے۔

Pesh Imam bitten by the snake he saved

By our correspondent

THATTA: A snake bit Moulvi Mohammad Ishaque, Pesh Imam of a mosque, when he stopped a number of people from killing it inside the mosque. Later the Pesh Imam succumbed to the bite. Eye witnesses said that a snake creeped inside the mosque, in Haran Jagir Village, Taluka Mirpur Bathoro, and some persons who came for prayers tried to kill it. But the Pesh Imam stopped them from killing the snake inside the mosque terming the act as adverse to religious norms, they added. He tried to catch and throw it out of the mosque. In his efforts, he managed to catch the snake, which probably did not knew the norms and bite the Pesh Imam killing him spontaneously inside the mosque.

طالبانِ
علم وادب کے لئے
گرین گائیڈ اکیڈمی کی شائع کردہ
نادر اور حسین کتابیں اب انتہائی خصوصی رعایت کے ساتھ دستیاب ہیں۔

اس پیشکش کا آج ہی فائدہ اُٹھایئے

یہ کتب آپ کے علمی خزانے میں گرانقدر اضافہ ہوں گی۔

	موجودہ قیمت مع ڈاک خرچ	بعد از رعایت مع ڈاک خرچ
۱ سب سے بڑا انسان ﷺ۔ سیرت طیبہ ﷺ پر سید نفر زیدی کی اہم تصنیف صدارتی ایوارڈ یافتہ۔ ڈی لکس ایڈیشن	۴۰ روپے	۲۵ روپے
۲ راہ نما قرآنی حکایات کا دلچسپ مجموعہ	۱۰ روپے	۸ روپے
۳ سفر مبارک حجازِ مقدس کا سفرنامہ بھی راہنما بھی	—	صرف ڈاک خرچ ۴ روپے
۴ تعلیم الاسلام ۴ حصوں پر مشتمل۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات	—	صرف ڈاک خرچ ۴ روپے
۵ حق اسکواڈ مہماتی کہانیوں کا سنسنی خیز مجموعہ	۱۰ روپے	۸ روپے
۶ کہنا بڑوں کا مانو تعمیر سیرتِ اطفال کے لئے خوبصورت	۴ روپے	۳ روپے

آپ صرف ۵۰ روپے کا منی آرڈر بھجوا کر تمام کتب یکمشت بھی منگوا سکتے ہیں

پتا :۔ گرین گائیڈ اکیڈمی۔ ۱۱۲۔ ڈی سائیٹ کراچی نمبر ۱۶۔

ہے حقیقت کچھ

سید عقیل عباس جعفری

مغالطہ :۔

تمام پرندے اڑ سکتے ہیں۔

حقیقت :۔

یہ درست ہے کہ تمام پرندے پر رکھتے ہیں۔ مگر کوئی پچاس کے قریب پرندے ایسے ہیں جو پر رکھنے کے باوجود طاقت پرواز نہیں رکھتے۔ ان پرندوں میں دنیا کا سب سے بڑا پرندہ شترمرغ بھی شامل ہے۔ شترمرغ اڑنے پر تو قدرت نہیں رکھتا مگر دوڑنے میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔ اس پرندے کی انتہائی رفتار تقریباً ۴۰ میل یا ۶۴ء۳۷ کلو میٹر فی گھنٹہ ہے۔

شترمرغ کے علاوہ جو مشہور پرندے، اڑ نہیں سکتے، ان میں کیوی، پینگوئن، ایمو، رہیا اور کسیا رییز شامل ہیں۔

بعض پرندوں کی نسل اڑنے کی صلاحیت نہ رکھنے کے باعث معدوم ہو گئی۔ جن میں بحرِ ہند کے جزائر ماریشس میں پایا جانے والا مشہور پرندہ ڈوڈو بھی شامل ہے۔ ڈوڈو کی نسل کا آخری پرندہ ۱۶۸۱ء میں فوت ہوا تھا۔

حوالے :۔

(Ref. Facts and Fallacies by Rhoda and Leda Blumberg. P. 27)

مغالطہ :۔

بلیاں مکمل تاریکی میں بھی دیکھ سکتی ہیں۔

حقیقت :۔

یہ درست ہے کہ ایسے مقامات پر جہاں روشنی انتہائی کم ہو، بلیاں دوسرے حیوانات کی بہ نسبت زیادہ بہتر طور پر دیکھ سکتی ہیں۔ مگر یہ خیال کہ بلیاں

مکمل تاریکی میں بھی دیکھ سکتی ہیں، درست نہیں۔

ایسے مقامات پر جہاں روشنی کا بالکل گزر نہ ہو، اور مکمل تاریکی ہو بلیاں ہی نہیں کوئی بھی جاندار کچھ نہیں دیکھ سکتا۔

حوالے :۔

Ref. 1. Facts and Fallacies by Rhoda and Leda Blumberg, P. 9

2. Don't You Believe It by Gyles Brandreth, P. 103

مغالطہ :۔

آپ کرۂ زمین پر کہیں بھی ہوں، قطب ستارہ آپ کی رہنمائی کرے گا۔

حقیقت :۔

قطب ستارہ، ایک ایسا ستارہ ہے جو ہمیشہ شمال کی جانب سے نظر آتا ہے۔ جس کا تذکرہ قدیم سفرناموں میں بھی ملتا ہے اور سیاحوں اور بحری جہازوں کے اس ستارے کو دیکھ کر اپنی سمت متعین کرنے کے واقعات تمام تاریخی کتابوں میں درج ہیں۔

مگر یہ خیال کہ قطب ستارہ، کرۂ ارض پر ہر جگہ سے نظر آتا ہے درست نہیں۔ یہ ستارہ کرۂ ارض کے صرف شمالی نصف حصے میں جسے NORTH HEMISPHERE کہتے ہیں، نظر آتا ہے جنوبی نصف حصے میں یہ ستارہ قطعی نظر نہیں آتا ہے۔

حوالے :۔

Ref. 1. Don't You Believe It by Graham and Sylvana Nown, P. 45

2. Facts and Fallacies by Rhoda and Leda Blumberg, P. 17

مغالطہ :۔

خطرہ دیکھ کر شترمرغ اپنا سر ریت میں چھپالیتا ہے۔

حقیقت :۔

ہزاروں سال سے شترمرغ کو حماقت کی علامت سمجھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ جب کبھی وہ خطرے میں گھرتا ہے تو وہ اپنا سر ریت میں چھپالیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کا پورا جسم دشمن کی نظر سے اوجھل ہوگیا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔

وہ اپنا سر ریت میں ضرور چھپاتا ہے مگر یہ عمل وہ خطرے کے وقت نہیں کرتا بلکہ پانی کی تلاش میں کرتا ہے۔

اور جب اس کا سابقہ کسی دشمن سے پڑتا ہے تو وہ اس سے بھرپور مقابلہ کرتا اور اپنی لمبی ٹانگوں کے ذریعے اسے زبردست لاتیں رسید کرتا ہے۔

اسی دوران وہ دشمن کو خوفزدہ کرنے کے لئے اپنا سر ریت میں چھپالیتا ہے اور اس طرح اس کا جسم اور اس کے پَر جھاڑیوں کی مانند دکھائی دینے لگتے ہیں۔ جب وہ خود خوفزدہ ہوتا ہے تو راہ فرار اختیار کرتا ہے۔ تمام پرندے تو اڑ سکتے ہیں مگر شترمرغ اڑ نہیں سکتا۔ وہ بہت تیز دوڑتا ہے اور اس کی رفتا ۶۳ء۶۴ کلومیٹر فی گھنٹہ کے لگ بھگ ہوتی ہے اس

لئے اس کے دشمن اس کا کچھ نہیں بگاڑ پاتے اور وہ لمحوں میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔

حوالے :۔

Ref. 1. The Dictionary of Misinformation by Tom Burnam. P. 196

2. Facts and Fallacies by Rhoda and Leda Blumberg. P. 27

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک غبار ہوں

میں نہیں ہوں نغمہ جانفزا، مجھے کوئی سن کے کرے گا کیا
میں بڑے بروگ کی ہوں صدا میں بڑے دکھی کی پکار ہوں

مرا رنگ و روپ بگڑ گیا، مرا بخت مجھ سے بچھڑ گیا
جو چمن خزاں سے اجڑ گیا میں اسی کی فصل بہار ہوں

پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں، کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی شمع لا کے جلائے کیوں کہ میں بے کسی کا قرار ہوں

یہ غزل بہادر شاہ ظفر کی نہیں بلکہ مضطر خیر آبادی کی ہے۔

مضطر خیر آبادی کا اصل نام سید افتخار حسین تھا۔ ۱۸۶۵ء میں خیر آباد (یو پی) میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں والدہ سے اصلاح لی۔ پھر امیر مینائی کے شاگرد ہوئے۔

مضطر صاحب نے اپنی ابتدائی زندگی کا بیشتر حصہ ٹونک میں بسر کیا۔ وہ یہاں سیشن جج تھے۔ اور اسی حیثیت سے وہ گوالیار آئے۔ قادرالکلامی کا یہ عالم تھا کہ ایک مقدمے کا فیصلہ انہوں نے فی البدیہہ نظم کر کے سنایا تھا۔

ان کے کئی شعر ضرب المثل کا درجہ رکھتے ہیں۔ تاہم حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کا کلام آج تک کلیات کی شکل میں نہیں چھپا...... ان کے صاحب زادے جاںنثار اختر نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنے والد کے کلام کو کلیات کی شکل میں مرتب کیا تھا۔ مضطر صاحب کا انتقال ۱۹۲۷ء میں گوالیار میں ہوا............ اور وہیں ان کی تدفین ہوئی ان کی اس غزل کا مقطع ہے ۔

نہ میں مضطران کا حبیب ہوں نہ میں مضطران کا رقیب ہوں
جو پلٹ گیا وہ نصیب ہوں جو اجڑ گیا وہ دیار ہوں!!

مارچ ۱۹۷۸ء (حوالہ فن اور شخصیت غزل نمبر ۳۲۸)

قدر داں

آرٹ کی نمائش میں ایک شخص نے اپنے برابر کھڑے ہوئے آدمی سے کہا "چھوٹی تصویروں کو دیکھ کر میرا دل بجھ جاتا ہے۔ جب کہ بڑی تصویر س مجھے ہمیشہ بہت خوبصورت اور دل انگیز معلوم ہوتی ہیں۔

قریب کھڑا ہوا شخص بولا "شاید آپ آرٹ کے قدر داں معلوم ہوتے ہیں۔"

اس شخص نے جواب دیا۔ "نہیں میں تو تصویروں کے فریم بنانے والا ہوں۔

عامر زیدی حیدر آباد

نوٹس بورڈ

اگر آپ آنکھ مچولی میں لکھتے ہیں یا لکھنا چاہتے ہیں تو درجِ ذیل باتیں ضرور پڑھ لیجئے۔

آنکھ مچولی میں تمام تحریریں اپنے معیار کے مطابق نمبر آنے پر شائع ہوتی ہیں۔

آنکھ مچولی میں (سوائے "قلم قتلے" کے) تمام شائع ہونے والی تخلیقات کا معاوضہ دیا جاتا ہے

نقل شدہ تحریروں، انتخاب، اقوال وغیرہ کا کوئی معاوضہ نہیں دیا جاتا۔

آپ تحریریں بھجوانے سے قبل یہ اطمینان ضرور کرلیں کہ آپ کی ہر تحریر کے پیچھے آپ کا نام اور پتہ صاف صاف لکھا ہوا ہے۔

ایک کاغذ پر دو مختلف نوعیت کی تحریریں قابلِ قبول نہ ہوں گی۔

اپنی تحریروں کے بارے میں یا کچھ اور جاننے کے لئے جوابی لفافہ ضرور بھجوائیں۔

اپنی ہر تحریر کے ساتھ "ذاتی کوائف، قلم کار" کا کوپن ضرور منسلک کریں جو اس شمارے کے آخری صفحات میں موجود ہے۔

لکھنے سے پہلے پڑھنے کی باتیں

آنکھ مچولی کا یہ شعبہ مختصر تحریروں پر مبنی ہے۔ ضروری نہیں کہ اس میں نئے لکھنے والوں ہی کی تحریریں شامل ہوں۔ بڑی عمر کے قلم کار بھی اس حصے کے لئے مختصر تحریریں بھجوا سکتے ہیں۔

ایک بات یاد رکھئے کہ تحریر جس قدر مختصر ہوگی اس قدر جلد شائع بھی ہو سکے گی۔ اسی طرح تخلیقی یا طبع زاد تحریروں کو دوسری تحریروں پر فوقیت دی جاتی ہے۔ آپ بھی کوشش کیجئے کہ آپ جو کچھ بھی لکھیں وہ آپ کا اپنا ہو خواہ اس کا معیار کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ ادارہ آنکھ مچولی کی کوشش ہوتی ہے کہ کمزور تحریروں کو بہتر بنا کر شائع کرے۔ معلومات اور مضامین وغیرہ میں گھسی پٹی چیزیں بھیجنے سے گریز کریں۔ اس سیکشن کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے ہم آپ کی تجاویز کا خیر مقدم کریں گے۔ (ادارہ)

توبہ کرلی

مرسلہ...... شبّر علی چنگیزی

خرم ایک سیدھا سادا شریف لڑکا تھا۔ وہ بڑوں کا ادب کرتا اور چھوٹوں سے محبت سے پیش آتا تھا۔ مگر اس میں ایک بُری عادت تھی کہ وہ بہت شیخی بگھارتا تھا۔ جب دیکھو یاروں دوستوں میں بیٹھا اپنی بہادری کے جھوٹے قصے سنا رہا ہوتا۔ گھر والے منع کر کر کے تھک چکے تھے۔ مگر وہ تھا کہ باز ہی نہ آتا تھا۔ کبھی کہتا ایک دفعہ میں دس آدمیوں کو چھٹی، ساتویں اور آٹھویں کا دودھ یاد دلا دیا۔ نویں، دسویں انہوں نے پاس ہی نہ کی تھی اس لئے اس کا دودھ یاد نہیں آسکا اور اس کی بات پر قہقہہ چھوٹ پڑتا۔

آخر ایک دن اسے سزا مل ہی گئی۔

ہوا یوں کے ایک دن بیٹھا وہ حسب معمول شیخی بگھار رہا تھا کہنے لگا کہ بھئی وہ پچھلی گلی میں راجا دودھ والا ہے نا، ایک دن اس سے میری تو تو میں میں ہو گئی میں نے کہا کہ بھئی پانی میں دودھ کم ملایا کرو۔ وہ چلا کر بولا "کیا کہا! پانی میں دودھ...... ؟ ہم تو دودھ میں پانی ملاتے ہیں، پانی میں دودھ نہیں۔" بس جی اسی بات پر لڑائی بڑھ گئی۔ میرا کہنا تھا کہ "تم پانی ملاتے ہو۔" جبکہ اس کا اصرار تھا کہ "وہ دودھ میں پانی ملاتا ہے۔" آخر مجھے غصہ آگیا میں نے ایک الٹے ہاتھ کا گھمایا اور وہ اچھل کر دس فٹ دور جاگرا۔ اس دن کے بعد سے "وہ پانی میں دودھ کم ملاتا ہے۔ ہاں بھئی اور سنو۔" ...... ابھی وہ کچھ اور سنانے والا

تھا کہ راجا ادھر آنکلا شاید وہ سب کچھ سن چکا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے قریب آیا اور بولا۔
"خرم جی میں تو اب بھی دودھ میں پانی ملاتا ہوں۔ پانی میں دودھ نہیں۔"
"کیا کہہ رہو تم؟" خرم نے بظاہر غصے سے کہا مگر اندر سے اس کی جان نکل چکی تھی۔ "آؤ آج بھی مجھے دس فٹ دور پھینکو۔" وہ طنزیہ انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔
راجا ڈیل ڈول میں کسی بھی طرح گینڈے سے کم نہ تھا اور خرم بیچارہ اس کی ران کے برابر بھی نہ تھا۔ خیر اب بات کا بھرم بھی تو رکھنا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ وہ بمشکل لرزتی ٹانگوں سے کھڑا ہو گیا۔ راجا اچھل کر سامنے آیا اور زور دار مکا خرم کے منہ پر رسید کر ڈالا۔ خرم کو آنکھوں کے آگے پورا نظام شمسی بریک ڈانس کرتا دکھائی دیا اور پھر وہ چکرا کر گر پڑا اس کے سر پر ایک عدد چھوٹا سا سر ابھر آیا تھا اور راجا یہ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔
"خرم! امید ہے تم آئندہ شیخی بگھارنے سے توبہ کر لو گے۔"
خرم تمام دوستوں کے سامنے شرم سے پانی پانی ہو چکا تھا اور راجا کے الفاظ ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ تب خرم نے سچ مچ کانوں کو ہاتھ لگایا اور توبہ کر لی۔

مہربان چیونٹیاں

مرسلہ...... عابدہ قریشی، چشتیاں

ثمرہ نہایت ہی فرماں بردار اور نیک بچی ہے ایک دفعہ وہ اپنے ابو کے ساتھ سیر کرنے جا رہی تھی۔ راستے میں شدید بارش شروع ہو گئی۔ ثمرہ اور اس کے ابو جلدی سے ایک گھنے درخت کے نیچے چلے گئے۔ اچانک ہی ثمرہ کی نظر اس درخت کے نیچے چیونٹیوں کے چھوٹے چھوٹے بِلوں پر جا پڑی اور ثمرہ نے دیکھا کہ بارش کا پانی ان کے بِلوں کے اندر جا رہا ہے ثمرہ کو ان چیونٹیوں پر بہت ترس آیا۔ اس نے ان بلوں کے ارد گرد دو تین اینٹیں

رکھ دیں کہ بارش کا پانی ان کے بلوں کے اندر نہ چلا جائے اور یہ ننھی ننھی چیونٹیاں مر نہ جائیں۔

کچھ دیر گزرنے کے بعد بارش بند ہو گئی۔ ثمرہ اور اس کے ابو باغ کی طرف چل پڑے۔ راستے میں وہ ایک ویران سڑک سے گزر رہے تھے کہ اچانک ہی ایک گولی ثمرہ کی ٹانگ میں آ لگی۔ یہ فائرنگ شادی کی خوشی میں کچھ لڑکے اپنی چھتوں پر کھڑے کر رہے تھے۔ ثمرہ کی ٹانگ سے خون کے فوارے ابل پڑے۔ اس کے ابو اسے فوراً ہی اسپتال کی طرف لے کر دوڑے۔ اسپتال اس جگہ سے بہت دور تھا اور ان کے پاس کوئی سواری بھی نہ تھی۔ اسپتال پہنچتے پہنچتے انہیں کافی دیر ہو چکی تھی اور ثمرہ کی ٹانگ میں زہر پھیل چکا تھا۔

ثمرہ کی امی بھی اسپتال پہنچ گئی تھیں اور وہ زار و قطار رو رہی تھیں۔ ڈاکٹروں نے ثمرہ کی ٹانگ کو صبح تک کاٹ دینے کا۔ فیصلہ کیا سب لوگ پریشان تھے اور اس ننھی اور معصوم بچی کے لئے دعائیں مانگ رہے تھے۔ آخر کار ان کی دعائیں رنگ لائیں۔ اچانک ہی ثمرہ کے ابو نے اس کی ٹانگ کو دیکھا تو اس کی ٹانگ کو ہزاروں کی تعداد سے چیونٹیاں، چپکی ہوئی تھیں۔ وہ فوراً ڈاکٹر کو بلا لائے۔ ڈاکٹر نے فوراً ثمرہ کی ٹانگ سے چیونٹیاں ہٹانی شروع کر دیں۔ لیکن اس وقت تک چیونٹیاں، ثمرہ کی ٹانگ کا سارا زہر چوس چکی تھیں ثمرہ کی ٹانگ کا سارا زہر ختم ہو چکا تھا اور وہ کافی حد تک ٹھیک تھی۔

سب لوگ بہت حیران تھے لیکن ثمرہ کے ابو جانتے تھے کہ یہ وہی چیونٹیاں تھیں جن کے بلوں کو پانی سے بچانے کے لئے ثمرہ نے اینٹیں رکھی تھیں۔ ثمرہ کی نیکی اس کے کام آ گئی تھی اس کی ٹانگ کٹ جانے سے بچ گئی تھی۔ ان ننھی چیونٹیوں نے اپنے احسان کا بدلہ چکا دیا تھا۔ سچ ہے محنت اور نیکی کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔

اقوال زریں

مرسلہ...... تحسینہ کلام، پشاور

..... سب سے بڑی خیانت ملت سے غداری ہے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

...... دل کی آنکھ عبادت سے کھلتی ہے۔ (امام جعفر صادقؒ)

...... خدا کے دشمنوں سے الفت کرنا خدا کے ساتھ دشمنی ہے۔ (مجدد الف ثانیؒ)

ہم شوق سے پڑھیں گے

ضیاء الحسن ضیاء

ہم شوق سے پڑھیں گے
ہم نونہال سارے
دھرتی کے چاند تارے
یہ عزم ہے ہمارا!!
آگے سدا بڑھیں گے
ہم شوق سے پڑھیں گے

نفرت کو ہم مٹا کر
سب کو گلے لگا کر
آپس میں بھائی بھائی
مل جل کے سب رہیں گے
ہم شوق سے پڑھیں گے

کافور ہوں اندھیرے
پُر نور ہوں سویرے
چمکے وطن ہمارا
ایسے جتن کریں گے
ہم شوق سے پڑھیں گے

معصوم ہیں تو کیا ہے
پُر حوصلہ بڑا ہے
اپنے وطن کے قائد
اک روز ہم بنیں گے
ہم شوق سے پڑھیں گے

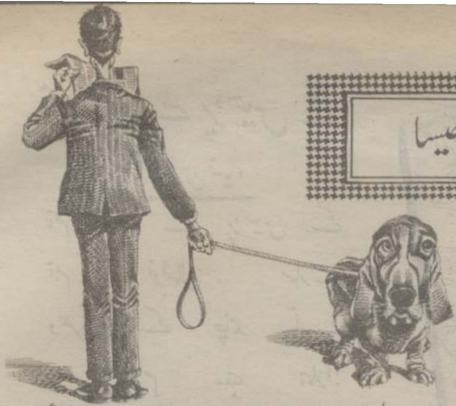

ایک جیسا

مرسلہ

ایم اسلم خان، مظفر گڑھ

ایک امیر آدمی تھا۔ اسے جانور پالنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے ایک کتا اور ایک گدھا بھی پال رکھا تھا۔ امیر آدمی ان جانوروں کی بڑی خدمت کرتا۔ خاص کر کتے کی۔ امیر آدمی ہر روز کتے کو پیار کرتا اور اسے اپنے ساتھ بیٹھا کر دودھ اور گوشت کھلاتا تھا۔ جبکہ گدھے سے وہ اکثر دور رہتا تھا۔ کتا بھی ہر وقت امیر آدمی کے پیچھے پیچھے دُم ہلاتا ہوا پھرتا رہتا اور جس جگہ بھی مالک (امیر آدمی) جاتا، ساتھ ہو لیتا۔

ایک دن گدھے نے دیکھا کہ کتا امیر آدمی کے پاس بیٹھا مزے سے دودھ گوشت کھا رہا ہے۔ گدھا اسے دیکھ کر جل گیا اور کہنے لگا۔ "آخر مالک اس کتے کو اتنا پیار کیوں کرتا ہے۔ میں دن بھر محنت کرتا ہوں، امیر آدمی کے نوکر کبھی کچھ لاد دیتے ہیں کبھی کچھ۔ اور جبکہ کتا سارا دن کچھ بھی نہیں کرتا بس دم ہلاتا رہتا ہے۔" گدھا سوچنے لگا اگر میں کتے کی طرح دم ہلاؤں، مالک کے پیچھے پیچھے چلوں، کودوں اچھلوں تو شاید مالک مجھے بھی اسی طرح پیار کرے گا جیسے کتے سے کرتا ہے۔

بس پھر کیا تھا گدھا دم ہلانے لگا۔ بھاگتا ہوا مالک کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہاں اس نے زور زور سے رینکنا شروع کر دیا۔ اور خوشی میں دلتیاں جمانے لگا۔ بس پھر کیا تھا دلتیاں الماری، میز پر موجود چیزوں کو گراتی گئی۔ گدھے نے اگلے دو پاؤں اٹھائے اور مالک کی گود میں رکھنے لگا۔ امیر آدمی گھبرا گیا اور وہ سمجھا کہ گدھا پاگل ہو گیا ہے۔ وہ زور سے چلانے لگا۔ "دوڑو! دوڑو!" شور سن کر نوکر بھاگے آئے اور گدھے کو مار مار کر باہر نکال دیا۔ بے چارہ گدھا سوچنے لگا" جو کتا کرتا ہے میں نے بھی وہی کیا، پھر یہ مار!!! بھلا یہ کہاں کا انصاف ہے۔" گدھا یہ نہیں سمجھا کہ سب جانور برابر نہیں ہو سکتے اور نہ ایک کا کام دوسرا کر سکتا ہے۔

بچپن کے ساتھی

راؤ منظر حسین ۱۳ سال نہم
انگریزی ڈاکٹر گورنمنٹ ہائی اسکول خان بیلا
کینال ریسٹ ہاؤس خان بیلا تحصیل لیاقت پور

محمد عالم ۱۶ سال گیارہویں
اکاؤنٹنگ پیانو نواز گورنمنٹ لیاقت کالج ملیر
شاہ فیصل کالونی کراچی

کامران حیدر ۱۴ سال نہم
سائنس انجینئر گورنمنٹ پائلٹ سیکنڈری اسکول
معرفت حافظ علی اسد اللہ ڈھیر انوالہ تحصیل چشتیاں بہاولنگر

محمد عاطف سعید ۱۴ سال نہم
سائنس وکیل گورنمنٹ بوائز سیکنڈری اسکول
۲۱۸۔سی بلاک ۶ ، گلشن اقبال ، کراچی

آصف حسن ۱۲ سال ششم
سائنس انجینئر دی سٹی اسکول

خالد یعقوب وڑائچ ۱۶ سال گیارہویں
انگلش ڈاکٹر گورنمنٹ جناح اسلامیہ کالج

جانور پرندے حشرات

مرسلہ...... طارق حسن، ملتان

(۱) ...... کیوی وہ واحد پرندہ ہے جس کی نظر کمزور ہوتی ہے۔

(۲) ...... گلہریوں کی بہت سے اقسام اڑ سکتی ہیں۔

(۳) ...... طوطے کی چونچ میں ۳۵۰ پونڈ فی مربع انچ کا وزن دبانے کی قوت ہوتی ہے۔

(۴) ...... ٹڈی اپنے وزن کے برابر خوراک کھانے کے بعد بھی پیٹ نہیں بھرتی۔

(۵) ...... زمین پر پائے جانے والے کل جانوروں میں کیڑے مکوڑوں کی تعداد اسّی فیصد ہے۔

(۶) ...... کاکروچ (لال بیگ) کا خون سفید ہوتا ہے، کیونکہ اس کے ہیموگلوبین میں لوہے کے بجائے تانبا ہوتا ہے۔

(۷) ...... گوئٹے مالا کا سکہ وہاں کے ایک پرندے پر رکھا گیا ہے۔ جس کا نام "کُٹزال" ہے۔

(۸) ...... نیو بیڈ فورڈ میں ایک مرغی نے ایک ایسا انڈا دیا ہے جو بالکل گول تھا۔

(۹) ...... کینساس میں ایک مرغی نے ایک ایسا انڈا دیا جس میں پانچ زردیاں تھیں۔

(۱۰) ...... جھینگا مچھلی ایک بند ڈبے میں کھلے ڈبے کی نسبت زیادہ دیر تک زندہ رہتی ہے۔

(۱۱) ...... سب سے کم عمر میں بچے دینے والے جانور کا نام ٹینرک (TENRIK) ہے، جو پیدائش کے تین یا چار ہفتے بعد افزائش نسل کے قابل ہو جاتا ہے۔

(۱۲) ...... ایک ٹیلرنگ کمپنی کے مالک کے گھر میں بلی نے ایک ایسا بچہ جنم دیا جس پر اس کمپنی کا ٹریڈ مارک کھدا ہوا تھا۔

(۱۳) ...... شتر مرغ وہ واحد پرندہ ہے جس سے چمڑہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

(۱۴) ...... زرافہ کو گونگا جانور بھی کہتے ہیں۔

"کوئیز کہانی" میں شرکت کا کوپن

نام ______ کلاس ______
عُمر ______ اسکول ______
پتہ ______

اپنے جوابات سادے کاغذ پر لکھئے اور یہ کوپن جواب کے ساتھ منسلک کیجئے۔ بغیر کوپن کے جواب قابلِ قبول نہ ہوگا۔

قلمی دوستی کے سلسلے "ساتھی بچپن کے" میں شرکت کا کوپن

نام ______ عُمر ______
کلاس ______ پسندیدہ مضمون ______
مستقبل کا خواب ______
اسکول ______
گھر کا پتہ ______

تصویر اس سائز میں ہو!

آپ کے نزدیک "دوستی" کا مفہوم کیا ہے۔ (ایک سطر میں) ______

آنکھ مچولی کا سالانہ خریداری کا کوپن

نام ______
مہینہ جس سے رسالہ شروع کروانا چاہتے ہیں ______
رقم ______ بذریعہ ______
پتہ ______
فون نمبر ______

سُنا ہو تو سُنائیے

دیکھا ہو تو بتائیے

کوئی ایسا ماہنامہ

جِس نے

- مُنفرد موضوعات پر ہر سال ڈ ٹو خاص نمبر شائع کئے ہوں۔
- جس کی سطر سطر تحقیق اور لفظ لفظ تخلیق سے عبارت ہو۔
- جِس کے خصُوصی شمارے اپنے موضوعات پر مُستند کتاب کی طرح مستقل علمی حوالہ بن گئے ہوں۔
- جِس نے اپنے خاص نمبر کے ساتھ انوکھے اور حسین تحائف دینے کی رسم ڈالی ہو۔
- اور جِس نے مختصر ترین وقت میں لامحدود اشاعت کا ریکارڈ قائم کیا ہو۔

اگر آپ ایسا ماہنامہ کہیں تلاش کر پائیں تو ہمیں ضرور مطلع کریں

ماہنامہ

آنکھ مچولی

ڈی-۱۱۲، سائٹ، کراچی

پاک وطن کے اچھے بچے

خالد بخاری

ہم ہیں پاک وطن کے بچے
پیارے بچے، اچھے بچے
پڑھنا لکھنا کام ہمارا
محنت کرنا کام ہمارا
علم و ہنر سے بڑھتے رہیں گے
اونچا دیس کا نام کریں گے
ہم ہیں قول کے پکے بچے
پیارے بچے، اچھے بچے
ہم سب راکھے دیس کے اپنے
اپنے دیس کے سندر سپنے
پاک وطن کی شان تو ہم ہیں
اس کی آن اور بان تو ہم ہیں
ثابت ہوں گے سچے بچے
پیارے بچے، اچھے بچے

امی ابو کا صفحہ

نئی نسل کی کردار سازی
اور تربیت کے لئے راہ نما خطوط

ہما نسیم

تصوّرات ہمیشہ مشاہدات کے نتیجے میں، واضح اور بہتر ہوتے ہیں۔ محدود دنیا اور تنگ دائروں میں رہنے والے لوگ اکثر گہری بات نہیں کرتے، دور کی نظر نہیں رکھتے اور بڑے خیالات کے مالک نہیں بن پاتے۔

آج کی دنیا ان معنوں میں بہتر مشاہدات کی دنیا ہے کہ گھومنے پھرنے کہیں نہ جائیں، تب بھی گھر میں رکھا ہوا ٹی وی سیٹ اور وی سی آر ہمیں دنیا بھر کی سیر کرواتے رہتے ہیں۔

آج کا بچہ بھی گزشتہ کل کے بچے سے بہتر مشاہدے کا مالک ہے۔ اسی لئے اس کی ذہانت کا معیار بھی بہتر ہے۔ آپ کی کوشش بھی یہی ہونی چاہئے کہ آپ بچے کو مشاہدے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کریں۔ آپ اپنے تئیں اس بات پر غور کرتے رہیں کہ وہ کون سی جگہ ہے، کون سا مقام ہے جو آپ کی دسترس میں ہے مگر آپ کے بچے نے اسے اب تک نہیں دیکھا۔ تفریح گاہیں، سمندر، پارک، فیکٹریاں، عمارات، آبشاریں، کھیت، کھلیان، نمائش، میلے، بازار، انسانی آبادیاں، لوگوں کے رہن سہن، ان کی رسمیں، درخت، نباتات، حیوانات اور وہ سب کچھ جو آپ اپنے بچوں کو دکھا سکتے ہیں، ضرور دکھایئے۔

آپ یقین کیجئے آپ کی یہ کوشش بچے کی شخصیت میں طلسمی تبدیلیاں اور اس کے خیالات میں ندرّت، گہرائی اور وسعت پیدا کرنے کا باعث بنے گی۔

رس بھرے پھل، رسیلا نورس
قومی مشروب
نورس
نورس
UQRA
شربت نورس
قدرت نے ذائقہ دیا، احمد نے محفوظ کیا

REGD. No. M-266 MAY 1992

MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI